JANUARY
2023

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

جناب منصور آفاق اور صدارتی ایوارڈ یافتہ شاعر جناب فرحت عباس شاہ
کی بیاض لاہور کے دفتر میں آمد کے موقع پر لی گئی تصاویر

غزل

زندگی میں کسی رُخ کا، کسی دُکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

درد بھی موج کے مانند سفر کرتے ہیں
اچھا رہتا ہے پلک پر کوئی تارا ہونا

ٹھوکریں مارنے لگتا ہے لہو نس نس میں
کتنا دشوار ہے تیرا مرا یکجا ہونا

ایک ہم ہیں کہ تیرے ہو کے بھی آوارہ ہیں
اپنی تقدیر ہے آوزۂ صحرا ہونا

کارگر کون رہا کارِ وفا میں خالد
کس کی قسمت میں ہے فرہاد کا تیشہ ہونا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - جنوری 2023 - شمارہ نمبر: 1

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور - 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ

www.trackntie.com
BAYAZ

نعمان منظور نے جدید پرنٹرز اور پبلشرز سے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ، سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، حسن عسکری کاظمی، حامد علی سیّد باقی احمد پوری، سرور حسین نقشبندی، محمد اشفاق بیگ	7 تا 12
2	نعتؐ	محمد یٰسین قمر، سعداللہ شاہ، تابش کمال، عقیل رحمانی اکرم ناصر، ناصر بشیر، نبیل احمد نبیل، محسن رضا شافی	13 تا 20
3	عقیدت	نسیمِ سحر، مرزا آصف رسول، اویس الغانی، مرزا غلام حیدر	21 تا 24
4	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	25 تا 28
5	حدیثِ دل	محمد ارشاد	29 تا 50
6	مضامین	سید افسر ساجد، فرحت عباس شاہ، نثار ترابی، نجیب جمال محمد ظہیر بدر، خیر زمان راشد، خالق آرزو	51 تا 89
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	90 تا 98
8	گفتگو	فرحت عباس شاہ، منصور آفاق	99 تا 105
9	شاعرِ امروز	اسامہ عندلیب [شاہد مالکی]	106 تا 108
10	غزلیں	خالد احمد، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، انور شعور، حسن عسکری کاظمی نسیمِ سحر، راحت سرحدی، محمد انیس انصاری، قیوم طاہر گلزار بخاری، رشید آفرین، نثار ترابی، خاور اعجاز سعداللہ شاہ، یعقوب پرواز، منظور ثاقب، اقبال سروبہ	109 تا 180

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	حریم حیدر، ہمایوں پرویز شاہد، رخشندہ نوید، اشرف کمال اکرم ناصر، طالب انصاری، ریاض ندیم نیازی، شوکت محمود شوکت اشرف نقوی، ذکی طارق، محمد سلیم ساگر، شاہد ماکلی نبیل احمد نبیل، اکرم جاذب، صغیر احمد صغیر، علمدار حسین افتخار شاہد، اعجاز روشن، تاثیر نقوی، وسیم جبران ارشد محمود ارشد، امتیاز گلیانوی، سید ضیا حسین، اسد اعوان حسنین سحر، رانا سعید دوشی، انیس احمد، احمد جلیل، آسناتھ کنول محمود کیفی، آفتاب خان، حسن پرویز سید، سید فرخ رضا ترمذی فیض رسول فیضان، محمد شفیق انصاری، عمر قیاز قائل، امر مہکی احمد سجاد بابر، محمد علی ایاز، مہر علی، نائلہ راٹھور، شہاب اللہ شہاب عالمگیر ہراج، ارسلان ساحل، عثمان حنیف، عطاالعزیز، غلام مرتضی رخسانہ سمن، محسن رضا شافی، شعیب عدن، ردا حاصل خلوص عاصم بخاری، عنبرین خان، شازیہ رباب، رجب علی رجب، رانا محمد شاہد	109 تا 180
11	مائیکرو فکشن	عاصم بخاری	181
12	افسانے	ابدال بیلا ، فرحت پروین ، فرخندہ شمیم آسناتھ کنول ، صوفیہ بیدار ، ثمینہ سیّد	182 تا 207
13	طنز و مزاح / خاکے	ناصر محمود ملک، کلیم خارجی	208 تا 213
14	نظمیں	آصف ثاقب، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر سید افسر ساجد، صفدر صدیق رضی، گلزار بخاری، حامد یزدانی آغا نثار، اقبال سروبہ، شاہنواز زیدی، اویس الحسن، تابش کمال رخشندہ نوید، افتخار شوکت، ارشد شاہین، سعدیہ بشیر، امجد بابر، ظہور چوہان، [احمد مطر العراقی / مترجم محمد احمد] علیم زبیر، نائلہ راٹھور، آفرینہ آفرین	214 تا 236
15	خطوط	آصف ثاقب، نسیم سحر، اشرف کمال، محمد شفیق انصاری فیض رسول فیضان، رانا محمد شاہد، رجب علی رجب	237 تا 241

حمد

کمالِ کُن کا مظاہرہ ہے
جو حُسنِ تخلیقِ کبریا ہے

کٹھن ہو منزل، اندھیری راہیں
وہ سیدھا رستہ دِکھا رہا ہے

فلک پہ تاروں کی ہیں ضیائیں
زمیں کو مئی کا رنگ دیا ہے

فلک نشیں ہیں بنائے پربت
وہاں سے دریا نکالتا ہے

پلک جھپکنے میں کچھ بھی کر دے
وہ سب کی اوقات جانتا ہے

اُسی کے آگے جھکیں جبینیں
کہ جس نے کیا کچھ ہمیں دیا ہے

شعور نیکی ہدی کا بخشا
بھلائی کو وہ سراہتا ہے

ہے اُس کی نشو و نما ثمرور
ریاضِ جنت ہرا بھرا ہے

سید ریاض حسین زیدی

حمد

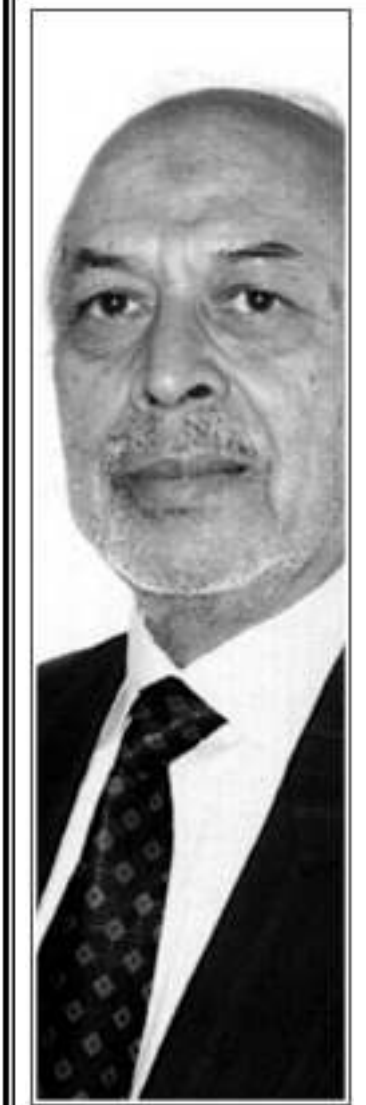

مائل حمد نگاری ہے طبیعت میری
ربِ ارباب جہاں تو ہے ضرورت میری

مجھ میں کیا وصف ہے ایسا بھی کہ تو نے یارب
دل میں مخلوق کے ڈالی ہے محبت میری

میں ہوں راحت میں یہاں یہ بھی کرم ہے تیرا
شکر ہے کب سے ٹلی سر سے مصیبت مری

دشمنِ جاں نے تو رستے سے ہٹانا چاہا!
اے خدا تو ہی تو کرتا ہے حفاظت مری

میں گنہگار ہوں تسلیم مگر ربِ کریم
میرے چہرے پہ ہے تحریر ندامت میری

تو کہ ہے قادرِ مطلق تیری قدرت کے نثار
ناتواں ہوں تو بڑھا دیتا ہے ہمت میری

میں کہاں جاؤں بھلا کس کو پکاروں کہ یہاں
تیری تسبیح سے وابستہ ہے راحت میری

حسن عسکری کاظمی

حمد

تری قدرت ہے یہ تیرا ہُنر ہے
جو شاخِ سبز پہ تازہ ثمر ہے

مجھے بھی استقامِ زندگی دے
مری ہستی میں سب زیر و زبر ہے

مرے عیب و ہُنر ہیں تجھ پہ ظاہر
مری ہر بات سے تُو باخبر ہے

تری آیات ہیں بخشش کا ساماں
تری حمد و ثنا بھی معتبر ہے

بلائیں دُور ہی رہتی ہیں مجھ سے
وظائف میں مرے خیرالبشرؐ ہے

مجھے حامدؔ وہ دیتا ہے سہارا
مرے معبود کی مجھ پر نظر ہے

حامد علی سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

میرا رازق ہے ، رازق خلیوں کا
حمدیں کیا پہنیں ، گجرا گیتوں کا

نعمان منظور

حمد

ردِ بلا قبولِ دعا اس کا اختیار
وہ ہے رحیم وہ ہے خدا اس کا اختیار

اس کو خبر ہے آمدِ فصلِ بہار کی
اس کا کرم ہے بادِ صبا اس کا اختیار

مرہم دوا علاج ہے چارہ گروں کا فرض
لیکن ہے اس کے ہاتھ شفا اس کا اختیار

میرے یقین سے بھی زیادہ ہے اس کا نور
میرے گمان سے بھی سوا اس کا اختیار

رازق وہی ہے سب کا مگر اس کا فیصلہ
کوئی ہے شاہ کوئی گدا اس کا اختیار

روزِ ازل سے تا بہ ابد، اس کے بعد بھی
اس کا ہے اقتدار سدا اس کا اختیار

باقی میں ایک ذرۂ خاکی ہوں اور کیا
میری حیات میری بقا اس کا اختیار

باقی احمد پوری

حمد

عاصی ہوں دعاؤں میں اثر دے مرے مولا
دامن گلِ امید سے بھر دے مرے مولا

بند آنکھوں کو آئینۂ گل رنگ دکھا کر
بینا دلِ بے نور کو کر دے مرے مولا

زنگ آنکھ کے پردے پہ پڑا ہے جو ہٹا دے
جلوہ ترا دیکھے وہ نظر دے مرے مولا

تپتے ہوئے موسم میں ملے ذکر کا سایہ
صحراؤں بھرے دل کو شجر دے مرے مولا

باطن کے جہانوں کی طرف اذنِ سفر ہو
نظروں کو مری حسنِ نظر دے مرے مولا

ہر صبح تری یاد سے ہو رشک بہاراں
ہر شب کو مری ایسی سحر دے مرے مولا

ہر حمد کے ہونے پہ دعا کرتا ہوں سرورؔ
توفیق یہی بارِ دگر دے مرے مولا

سرور حسین نقشبندی

حمد

نہ کچھ بے سبب ہے نہ کچھ بے محل ہے
یہ کارِ جہاں سب اُسی کا عمل ہے

ہے جو کچھ جہاں میں اُسی کا ہی سب ہے
جو میرا تمھارا جہانوں کا رَب ہے

ہر اک جان راضی ہے اُس کی رضا میں
اُسی کا ہے جو کچھ ہے ارض و سما میں

نہ ہے کو شے اُس کی قدرت سے باہر
نہ اُس کی کوئی کبریائی کا مُنکر

یہ چاند اور سورج یہ روشن ستارے
یہ تابع ہیں احکام کے اس کے سارے

اُسی کو ہی زیبا ہے ہر اک ستائش
کرے ہے وہی رزق بست و کشائیں

وہ حاکم ہے سب حاکموں سے سوا ہے
میں بندہ ہوں اُس کا وہ میرا خدا ہے

یہ اُس کا کرم ہے یہ اُس کی عطا ہے
کہ اشفاق نے لکھی حمد و ثنا ہے

محمد اشفاق بیگ

نعتؐ

اس جہاں میں ہی مولا جنتیں عطا ہو جائیں
مجھ کو شہرِ طیبہ میں محبتیں عطا ہو جائیں

ہم نے عارضِ گل پر ایک نعت لکھنی ہے
رنگ و نور و نکہت کی ندرتیں عطا ہوجائیں

جس میں بس نظر آئے شانِ احمدؐ مرسل
مجھ کو اس بصیرت کی دولتیں عطا ہو جائیں

دھڑکنوں میں شامل ہو حبِّ سیّدؐ سادات
اُنؐ کے خانوادے سے نسبتیں عطا ہو جائیں

اُنؐ کا نام لیتے ہی جان کو قرار آئے
نرم یوں ہو دل میرا ، راحتیں عطا ہو جائیں

چار دانگِ عالم میں اس کی ہے پذیرائی
جس کو شاہؐ والا کی قربتیں عطا ہو جائیں

مجھ سے بے بضاعت پر بابِ لطف کھل جائے
اُن خنک فضاؤں کی ثروتیں عطا ہو جائیں

ہے قمر فرومایہ بارگاہِ مدحت میں
علم و حلم و حکمت کی نعمتیں عطا ہو جائیں

محمد یٰسین قمر

نعت

اک مسافر ہوں کڑی دھوپ میں کملایا ہوں
اے شہاؐ سایۂ رحمت کہ میں بے سایہ ہوں

اک شکستہ سا ہے دل اور بھری دو آنکھیں
آپ کے در پہ محبت کی سند لایا ہوں

اے خوشا بخت پڑی خاک مدینہ سر پر
میں تو اک حیرت خوش رنگ میں پتھرایا ہوں

دانا چگنا چلا جاتا ہوں کبوتر کی طرح
یہ مرا رزق تھا میں اڑتا چلا آیا ہوں

وائے خاموشی کہ ٹوٹی نہیں اک لمحے کو
اور میں اظہار پہ قابو نہیں رکھ پایا ہوں

چند گھڑیاں جو میسر ہوئیں قربت میں تری
ان سے دوری کے زمانے پہ میں پچھتایا ہوں

بعد مدت کے ہوئی نعت تو زندہ ہوا میں
سعد میں گنبد خضرا ہی سے خضرایا ہوں

سعد اللہ شاہ

نعتؐ

الحمد کا سرور ہے صدقے میں آپؐ کے
خیرالوریٰؐ کا نور ہے صدقے میں آپؐ کے

خیرات خیر دہر کو شاداب کر گئی
نخل جہاں پہ بور ہے صدقے میں آپؐ کے

پائی ہے خاکِ شہرِ مدینہ سے ہر دوا
ہر درد دل سے دور ہے صدقے میں آپؐ کے

تنہا تھا ابتدائے مسافت میں ایک دن
اب ساتھ ایک پُور ہے صدقے میں آپؐ کے

یہ نبضِ کائنات ہے بس آپؐ کے طفیل
سب کچھ مرے حضورؐ ہے صدقے میں آپؐ کے

در اور کوئی ذہن میں آئے بھلا تو کیوں
شاداں دلِ غیور ہے صدقے میں آپؐ کے

تابش عطا و فیض کا جاری ہے سلسلہ
انوار کا وفور ہے صدقے میں آپؐ کے

تابش کمال

نعتؐ

درود ہونٹوں نے جب بھی پڑھا قرینے سے
ہوائیں عطر کی آنے لگیں مدینے سے

ہمارے خون کی ہر بُوند آفتاب بنی
جب عکس روضے کا لپٹا ہے دل نگینے سے

ابھی جو چوم کے آیا ہے ارضِ طیبہ کو
لپٹ کے روئے ہیں عشاق اس سفینے سے

غلام تیرےؐ غلاموں کے، چاہتے ہیں بس
ملے وَرُود کی دولت تیرے خزینے سے

پلانے والے اگر آپؐ ہوں میرے آقاؐ
تو پیاس بجھتی ہے کوثر کا جام پینے سے

ملے جو خاکِ مدینہ تو چوم کر اسکو
لگائیں آنکھوں میں اور پھر لگائیں سینے سے

وہ زندگی جسے سرکارؐ کی طلب ہی نہ ہو
عقیلؔ موت ہی بہتر ہے ایسے جینے سے

عقیل رحمانی

نعتؐ

مہکے ہیں مرے شام و سحر ذکر نبیؐ سے
رہتا ہے معطر مرا گھر ذکر نبیؐ سے

رہتی ہے مرے منہ میں حلاوت اسی باعث
رکھتا ہوں زباں کو جو میں تر ذکر نبیؐ سے

ہے کتنی مسافت پہ مرے گھر سے مدینہ
کٹ جاتا ہے یہ سارا سفر ذکر نبیؐ سے

دن بھر تمہیں آغوش میں رکھ لیتی ہے رحمت
دن کا ہوا آغاز ہو گر ذکر نبی سے

یہ ذکر ہے وہ ذکر جو خود کرتا ہے مالک
مالک سے ملاقات تو کر ذکر نبیؐ سے

تاثیر ہے کیا اس میں اسے کر کے ذرا دیکھ
تسخیر زمانے کو تو کر ذکر نبیؐ سے

تو دیکھنا اک روز کہ اس ارض و سما کا
یہ سارا خلا جائے گا بھر ذکر نبیؐ سے

اکرم ناصر

نعتؐ

[علامہ اقبال کی زمین پر]

عالمِ جہل میں نُور، آپؐ کے پیغام سے ہے
یہ جو خورشید ہے، یہ اَور کسی کام سے ہے

سر جُھکائے ہوئے آتے ہیں شہنشاہِ جہاں
بھیک اُس دَر کی فزوں خلعت و اِنعام سے ہے

آپؐ کے روضے کی دِیوار سے لگ کر جو کٹی
لُطف جینے کا اُسی صبح، اُسی شام سے ہے

ایک دِن ساقیٔ کوثر جو پلائیں گے مجھے
میری رَگ رَگ میں نشہ ایک اُسی جام سے ہے

لے کے جائے گی یہی سُوئے مدینہ اِک دِن
ایک اُمید مجھے گردشِ ایّام سے ہے

میرے کانوں میں جو اُترا تھا اذاں کے رَستے
"نبضِ ہستی، تپش آمادہ اُسی نام سے ہے"

آپؐ کی نِسبتِ عالی کے سبب ہے ناصرؔ
جو عقیدت مجھے طیبہ کے در و بام سے ہے

ناصر بشیر

نعتؐ

سلیقہ زندگی کرنے کا بھی وہیں سے ملا
جو فیضِ دیں مجھے محبوبِ عالمیں سے ملا

بفیضِ گنبدِ خضریٰ ہیں ایک ارض و سما
یہ آسمان ہے اور آسماں، زمیں سے ملا

مِری نگاہ رسولِ امیں کے در پہ ہے
سُراغ صبحِ زمانے کو بھی وہیں سے ملا

بفیضِ شاہِ اُمم ذوقِ سرورِ دیں
ملا تو مکتبِ عرفان و علم دیں سے ملا

نگاہِ سرورِ دیں سے بدل گئی قسمت
کہ بختِ مطلعِ انوار اُس جبیں سے ملا

مرے خیال، مرے فکر و فن کا سوز مجھے
نَفَس نَفَس اُسی ریحانِ عنبریں سے ملا

مثالِ شعلہ دہکتے تھے میرے روح و بدن
سکونِ دل مجھے آقائے شبنمیں سے ملا

دُھواں دُھواں تھی فضا اور تیرگی تھی بہت
جہاں کو حُسن مگر حُسنِ عنبریں سے ملا

رواں ہے نبضِ دو عالم نبیِ مرسَل سے
نشاطِ روح کا ساماں اِسی یقیں سے ملا

دل و نظر کو وہی روشنی دکھاتا ہے
خیالِ صدق جسے صادق و امیں سے ملا

مرے شعور کو بخشیں لطافتیں کیا کیا!
بیاں کا سارا قرینہ اُسی جبیں سے ملا

مرے حضور کی رحمت کے ہی سبب سے ہے
سکوں جو مجھ کو ہمیشہ دلِ حزیں سے ملا

یہ عجز و فقر کی دولت، سکونِ قلبِ حزیں
زہے نصیب کہ اُس بوریا نشیں سے ملا

خُدا کا آخری پیغام بھی نبیل ہمیں
دیارِ طیبہ کے پیغام آفریں سے ملا

نبیل احمد نبیل

نعت ﷺ

اے شفیع المذنبیں ، محبوبِ یزداں السّلام
غم گسارِ دل فگاراں ، راحتِ جاں السّلام

فخرِ ابراہیم و آدم ، آبروئے انبیاء
صاحبِ خُلقِ عظیم اے فخرِ انساں السّلام

حق تری توصیف کا کوئی ادا کر پائے کیا
اے حبیبِ ربِ کُن ، تفسیرِ قرآں السّلام

برگ و گل ، بادِ صبا ، یہ طائرانِ خوش نوا
کہہ رہے ہیں جھوم کر سب شاہِ خوباں السّلام

آپ ہی کے نور سے اے رحمت اللعالمیں
زندگی کا ایک اک پل ہے درخشاں السّلام

آپ کی مدحت کے لائق ، علم و فن ہے کب شہا؟
کب لغت میں ہیں شہا الفاظ شایاں ، السّلام

صبحِ ادل ہی سے شافی روشنی اُن کے سبب
ماحیء ظلمات ، اے شمعِ فروزاں السّلام

محسن رضا شافی

عقیدت

عشقِ نبیؐ کے دل میں ہیں جذبات موجزن
بے ساختہ ہیں لب پہ مناجات موجزن

اپنی زباں میں صلِ علیٰ کہہ رہی ہے یہ
ہے میری چشمِ نم بھی مرے ساتھ موجزن

ہر لحہ سیلِ اشک رواں کیوں نہ ہو، کہ جب
یادِ نبیؐ سے دل میں ہے برسات موجزن

نُورِ مدینہ دل میں ہے روشن، تو ہے یقیں
اِس میں نہ ہو سکے گی سیہ رات موجزن

سب کچھ بھلا دیا ہے مجھے اُنؐ کی یاد نے
کیوں ذہن و دل میں اب ہوں حکایات موجزن!

جب تک ہُوں اُنؐ کی چشمِ کرم کے حصار میں
ہو پائے گی نہ گردشِ حالات موجزن

مدحِ نبیؐ جو لکھنے لگا مَیں تو ہو گئے
ہر لفظ میں حروفِ تحیّات موجزن

سب کچھ عطا ہوا، ڈھ ہمیں آپؐ کے طفیل
جو ہے درونِ ارض و سماوات موجزن

گزرے جو اُنؐ کے در پہ درود و سلام میں
رہتے ہیں مجھ میں اب وہی لمحات موجزن

ہم کو بھی ہو قرینہ قرأت کا اب نصیب
لہروں کی شکل میں بھی ہیں آیات موجزن!

مَیں کیوں نہ اُنؐ کے عہد میں پیدا ہوا نسیمؔ
ہر دم ہیں دل میں بس یہ خیالات موجزن

نسیمِ سحر

عقیدت

شاعری ہو نہیں سکتی وہ نوائے زریں
جیسے قرآں ہے محمدؐ کی ثنائے زریں

کُنتُ کَنزاً کا وہ حق پردۂ مخفیاً سے
کس کی صورت میں ہے ظاہر بہ ضیائے زریں

وہ محمدؐ ہے، وہ احمدؐ ہے، وہ محمودؐ ابد
اسی حمّاد کا ہے حمدؐ لوائے زریں

اپنی کملی میں چھپالیں گے سرِ حشر ہمیں
کیا ہے خوب اپنا اثاثہ یہ رجائے زریں

مسکن اپنا ہو مدینے میں تو ہم سمجھیں گے
ہم فقیروں کی ہے دنیا بھی سرائے زریں

نعت کا حق نہ ادا ہوگا بھلے لفظوں کے
تنِ معنیٰ پہ ہو جیسی بھی قبائے زریں

ان کو تحریف کے کس زنگ کا خطرہ ہوگا
جو اصول آ کے محمدؐ نے سکھائے زریں

ہر عبادت کا ہے مقصود جو خوشنودیِ حق
ہے محمدؐ کی رضا میں وہ رضائے زریں

دین اک دولت و ثروت ہے ہر اک دل کے لئے
دیں کی دولت ہے محمدؐ کی ادائے زریں

جیسے آصف! سفرِ طیبہ کو میں سوچتا ہوں
منظر اللہ وہ ایسے ہی دکھائے زریں

مرزا آصف رسول

رہبرِ مجد و عُلا

اویس الغافی

اِسی سے وفا کی ابتدا، اِسمُہٗ اَحمد
اِسی پہ وفا کی انتہا، اِسمُہٗ اَحمد

زمیں کیا فلک بھی سرنگوں ان کے آگے ہے
وہی رہبرِ مجد و عُلا، اسمہ احمد

خدا نے ہی عرش و فرش سب کو سجایا ہے
انہی کے لیے سب کچھ بنا، اسمہ احمد

سہارا بنے ہیں غم زدوں کا رسول اللہ
ملی آپ سے دل کو شفا، اسمہ احمد

وہ اللہ احد ہے یہ محمدؐ نے فرمایا
خدا نے بتایا حق نما، اسمہ احمد

غنیٔ مصطفیٰؐ نے ہی کیا ہے فقیروں کو
وہی صاحبِ جود و سخا، اسمہ احمد

گدائی اگر مجھ کو ملے ان کے روضے کی
میں کرتا رہوں ان کی ثنا، اسمہ احمد

نہ کیوں نام لوں غافیؔ! میں صبح و مسا ان کا
اسی میں ہے ایماں کی بقا، اسمہ احمد

عقیدت

اے کہکشانِ قدس کے تابندہ آفتاب!
تیری ضیا سے عالمِ امکاں ہے بے حجاب

تیری ہر ایک رمز ہے سرچشمۂ علوم
تیرا ہر ایک لفظ ہے سررشتۂ کتاب

ارض وسما کی وسعتیں تیری ہے ایک جست
عرشِ بریں کی رفعتیں تیری ہیں ہم رکاب

تخلیقِ کائنات سے اول تیرا وجود
تکمیلِ روزگار میں آخر تیری کتاب

ہے کائنات تیرے محاسن کا اک ورق
لوح وقلم ہے تیرے فضائل کا ایک باب

جھکتے ہیں تیرے در پہ شہنشہ بصد ادب
رکتے ہیں تیرے حکم سے خورشید و ماہتاب

رحمت ہے عالمیں پہ ہمیشہ تیرا ظہور
سارے جہاں ہیں تیری ہدایت سے فیضیاب

گمنام تیرے فضل سے عزت میں نامور
مظلوم تیرے عدل سے ظالم پہ فتحیاب

رہزن ترے اشارۂ ابرو سے رہنما
گمراہ تیرے نقشِ کفِ پا سے راہ یاب

حیراں ہیں بایزید و جنید اس مقام پر
حیدرؔ! یہ بارگاہِ ادب اور سخن کی تاب

مرزا غلام حیدر

اللہ کو چن لیں

بزرگوں سے اک واقعہ سنا۔ کوئی اللہ کے سچے دوست تھے ان کے بہت سے چاہنے والے بھی تھے ایک مرید خدمت حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''میرے ساتھ میرا بیٹا ہے اک عرصہ سے بیمار ہے شفا نہیں مل سکی آپ دعا فرمائیں''

بزرگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

اگلے ہی روز بیٹا شفایاب ہو گیا بالکل تندرست ہو گیا مرید سیانا تھا واپس بزرگوں کے پاس دوڑا دوڑا آیا اور پھر عرض کیا:

''آپ کو میں دیکھ رہا ہوں کہ سالہا سال سے بیمار ہیں آپ اپنے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟،،

بزرگ فرمانے لگے:

''ہاں دعا تو میں نے کی تھی جواب یہ ملا کہ پہلے یہ فیصلہ کر لو۔ یہ وجود تمہارا ہے یا ہمارا ہے اس نگرانی تمہیں کرنی یا ہمیں کرنی ہے اس بات کو چن لو اور حتمی فیصلہ کر لو، تو میں دل ہی دل میں اپنے اللہ سے کہا ہم بھی آپ کے دل بھی آپ کا یہ جسم بھی، یہ روح بھی آپ کی جب آپ کو چن لیا تو پھر سارے اختیار بھی آپ کے ہی ہیں''

جب مالک کا انتخاب آپ نے کر لیا تو پھر نہ سوال ہو نہ طویل ہو نہ پوچھ تاچھ ہو نہ ہی مداخلت جیسے وہ چاہیں وہ کریں سب کچھ ہے جو انہی کا ہے یہ ایک بڑا ہی خفیہ پرائیویٹ اور کسی کو نہ بتلانے والا تعلق ہے ایسا تعلق جس کا آپ کے قریبی احباب یا گھر والوں کو بھی ہو سکتا پتہ نہ ہو اللہ کو چن لینے والا آرٹ اک ایسا فن ہے جو نہ ہی ہر کسی کو آتا ہے اور نہ ہی یہ ہر کسی کو عطا ہوتا ہے اک بار اس فن کی باریکیاں کسی پر کھل گئی تو یوں سمجھیں دنیا اور اس کے اندر موجود ساری دولتوں کے خزانوں سے کہیں زیادہ مل گیا۔

یہ اک ایسا حیرت انگیز اور سحر انگیز تعلق ہے کہ اس کی دنیا اس کا جہان ہی کوئی اور ہے ان

سلیمان عبداللہ ڈار

دیکھا مگر دیکھا بھالا نہ سمجھ میں آنے والا مگر بالکل عیاں سب سے کمزور مگر سب سے مضبوط بھی۔ کمزور اس لیے کہ مجھ جیسوں کا ایمان تو چار آنے پر بک جاتا ہے اور اصلی ایمان ہی اس کی بنیاد ہے مضبوط بھی یہی سب سے زیادہ ہے کہ بندہ سب کچھ اس پر قربان کرنے کو تیار، صدیقین صالحین اور شہدا گردن کٹانے کو خوشی خوشی تیار یعنی سب سے مہنگا بھی یہی اور بندے کی ناسمجھی کی وجہ سے معاذ اللہ ارزاں بھی یہی۔

اگر دروازہ پتھر کا ہو تو دستک ریاضت ہے لیکن دروازے کے پیچھے پتھر ہو تو دستک ہمہ وقت دنیا دار میں تو جیسے میں نے عرض کیا دروازے دستک اور سوالی کا ہی تعلق ہے مگر اللہ کیسا کریم ہے کہ جس کا دروازہ نہ ہی پتھر ہے اور نہ وہ کبھی بند ہوتا ہے کچھ ضرورتیں بھی عزت نفس رکھتی ہیں ان کے لیے بار بار ہاتھ نہیں پھیلائے جاتے محبت انسان کی ازلی اور ابدی ضرورت ہے اور ضرورت بھی ایسی کے جس کے بغیر نہ ہی گزارا نہ ہی کوئی چارہ نہ چارہ گر تو پھر محبت کیوں نہ ایسے مالک سے کریں جو ہاتھ پھیلانے کی نوبت ہی نہ آنے دے جو بن مانگے عطا کرے۔

اس سے قبل کے سوال دل میں پیدا ہو وہ محبوب حقیقی سوال پورا کرے۔ طوفان میں کشتیاں اور گھمنڈ میں ہستیاں ڈوب جاتی ہے مگر جب اللہ جو چن لیا تو سارے گھمنڈ محبت کی لہر میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے۔ یہ بڑی بڑی ہستیاں کشتیاں جلا کر آتی ہیں محبوب حقیقی کے پیار کو پانے کے بعد کس کا جی چاہے گا کہ وہ دنیا کے خود غرض تعلقات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے کہ ایسا سوچنا بھی معاذ اللہ عشق حقیقی کی توہین ہے۔

زندگی میں آنسو بھی ہیں التجائیں بھی ہیں دعائیں بھی بے فکریاں بھی ہیں بے راہ رویاں بھی ہیں تو کیوں نہ مالک کی یاد میں بہنے والے آنسو ہی چن لیں عمر رواں میں آسائش بھی ہیں تکلیف بھی ہیں ہم اپنے دوستوں کے لیے آسانیاں پیدا کیوں نہیں کر سکتے احباب کے لیے رشتہ داروں کے لیے جنت دینے دلانے پر تو فوراً آجاتے ہیں مگر مال کی ایسی محبت دل میں ہے کہ اسے غریب رشتہ داروں پر خرچ نہیں کرتے یہ کیسی جنت ہے جسے قربانیوں کے بغیر حاصل کرنے کے لیے ہر روز تیار رہتے ہیں مال کو چن لیتے ہیں محبت کو رحمت کو فضل کو درگزر کو دعا کو اور التجا کو عطا کو کیوں نہیں چنتے؟ جب اللہ کا انتخاب کر لیا تو دو باتیں ہوں گی۔

*تسلیم ملے

*طاقت ملے

اگر تسلیم ملے تو بندہ بندگی پر آئے گا اپنا سب کچھ اللہ پر وار دے گا محبت کرے گا محبوب حقیقی کو پانے اور پا لینے کی جستجو کرے گا کہ وہ جان لیتا ہے کہ جستجو کو کبھی شکست نہیں ہوا کرتی۔ اگر طاقت کو چن لیا تو پھر وہ نمرود والی

ہامان والی شداد والی اور فرعون والی خصوصیات کا حامل بنے گا۔اب چن لینا اپنا اپنا اختیار ہے دونوں صورتوں میں مہلت موجود ہے مگر موت کے بعد ناختم ہونے والی حقیقی اور اصلی زندگی میں نتائج بہت مختلف ہوں گے تسلیم والا کیا کرے گا معاف کرنے کو چن لے گا حالانکہ یہ سچ ہے کہ کسی کا دل توڑ کر معافی مانگنا بہت آسان ہے لیکن اپنا دل ٹوٹنے پر کسی کو معاف کرنے بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ جو معاف کرے گا اور اس پر اللہ کی رضا والی نیت کرے گا تو یوں سمجھ لیجیے کہ اس نے اللہ کو چن لیا۔اور جس کی خوشی کے لیے اس نے معاف کیا وہ یہ بات خوب جانتا ہے۔ بندہ آخر کیا چاہتا ہے۔

* اللہ کا قرب مل جائے۔
* چلیے دنیا دار ہو تو خوشیوں کا مرانیوں اور کامیابیوں ہی کا طالب ہوگا۔
* آپ قلب کی صفائی چاہتے ہیں خواہش ہے کہ دل سے دنیا کا گند نکل جائے۔
* احسان کرنے والے بن کر جینا چاہتے ہیں؟
* اللہ ہی کے لیے دوستی اللہ ہی کے لیے دشمنی چاہتے ہیں۔
* کبر سے بچنا چاہتے ہیں
* سچی توبہ کرنا چاہتے ہیں
* لمبی لمبی آرزوؤں سے بچنا چاہتے ہیں؟
* توکل چاہتے ہیں؟
* اللہ کی صفات جاننا چاہتے ہیں
* دیدار خداوندی کے طالب ہیں
* زندگی میں مال میں صحت میں ایمان میں برکت کے خواہش مند ہیں۔
* گناہ کو کفر کا پیش خیمہ سمجھتے ہوئے اس سے بچنا چاہتے ہیں
* اپنے خالق سے مانوس ہونے کو جی چاہتا ہے؟
* کیا عارف باللہ بننا مقصود ہے
* نفس کی سرکشی سے بچنا چاہتے ہیں

تو پھر اپنے اللہ کو چن لیں ہر خواہش اس کی مرضی کے تابع ہو جائے۔ ہر دم ہر آن ہر گھڑی اللہ کو یاد کریں اسی کے نام کی مالا جپتے رہیں اور یہاں اک بات بہت ہی ضروری ہے کہ اللہ کو جب بہت یاد کیا۔ راتوں کے پچھلے پہر بھی بڑی محبت سے یاد کیا دل ہی دل میں پیار بھری باتیں بھی کر لیں تو کبھی بھی اسے ان یادوں کا احسان نہ جتلانا۔

اگر کسی روز بندہ غم دوراں غم ہجراں اور غم دنیا سے گھبرا کر یا یونہی کسی خوشی نصیبی کی وجہ سے اللہ جل شانہ کا انتخاب کرنا چاہیں (اور یہ کیسا دلکش دلکشا اور دل نشیں انتخاب ہوگا) تو کچھ عرصہ بعد تو ہی تو والی کیفیت طاری ہو سکتی ہے میں نا ہیں سب تو ہی والا معاملہ قسمت سے ہوتا ہے نصیبوں سے ملتا ہے دراصل اس جہاں پر اگر تھوڑا سا بھی غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر کثرت وحدت کی طرف جا رہی ہے ایک پودا اگتا ہے اس پر بالیا اگتی

ہیں ایک ایک بالی میں کئی کئی دانے ہوتے ہیں۔ انہی میں سے دانہ دانہ کسان پھر زمین کے حوالے کر کے آ جاتا ہے۔

میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ اب کسان کی ڈور اللہ پر ہے پھر اس سے کئی سو دانے وجود میں آ جاتے ہیں اس دنیا کے پہاڑوں مرغزاروں اور کہساروں کی کثرت اللہ کے کن کی بدولت ہے مگر یہ سب نظارے کسی کی طرف اک روز لوٹ جائیں گے تو ہر کثرت وحدت کی طرف مراجعت اختیار کرتی ہے اور اس کائنات کی ہر چیز میں اللہ جل شانہ کی وحدت چھپی ہوئی ہے اور آشکار بھی ہے تو بہت سی سمتوں بہت سی جہتوں اور بہت سی راہوں کے بجائے اسی وحدت ہی کو کیوں نہ چن لیں ایک ہو کر جو بے شمار ہوا ایک ہو کر بھی جس کی گنتی نہ ہو سکے کیوں نہ اس کا ہی انتخاب کر لیں۔

ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟ اگر فرد ایسا کرے گا تو اس کی زندگی میں سکون آئے گا اطمینان دل میں ڈیرا بسائے گا حاصل یہی بندہ جو واویلا کرتا تھا مطمئن اور مسرور رہے گا اور فلاح پائے گا اگر معاشرہ ایسا کرے گا تو اس کی بہترین مثال معیشت کے وقت والے مگر معظمہ کی ہے غیر مسلم دانش ور بھی اس بات پر حیران ہیں کہ اک انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے میں جب چنے ہوئے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے واحدنیت کو چن لیا اور تین سو پینسٹھ بتوں کو رد کر دیا تو یہی معاشرہ پوری دنیا کو زندہ رہنے کے زریں اصول بتلانے والا بن گیا کہ انھوں نے ایک اکیلے تن تنہا اللہ کو چن لیا اور سینکڑوں بتوں کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا۔

انتخاب مکہ میں رہنے والے ایمان لانے والوں کا تھا۔ رحمۃ اللعالمین کو بھیجنا اللہ کا کام تھا اللہ تو وہی ہے آج بھی اگر ہمارا معاشرہ اس کو چن لے اس ایک کو منتخب کر لے تو اقوام عالم میں ہمارا قد کاٹھ سب سے اونچا ہو سکتا ہے پھر کیا ہوگا؟ پھر یہی بحران جو ہر روز درپے آزار رہتے ہیں معاشی سیاسی سماجی مسائل پیدا کرتے ہیں یہی بحران نئے نئے مواقع پیدا کریں گے یہ مشکلات یوں دن رات گھیرے میں لیے رہتی ہیں انہی کے درمیان سے کامیابی کی طرف جانے والا لے نکلیں گے مگر جب انتخاب ہی غلط ہو جب چیزوں کو انتخاب کیا جائے جب دنیاوی خواہشات اور لمبی لمبی آرزوؤں کی کوئی حد ہی نہ ہو اور کوئی سرحد ہی نہ ہو تو اللہ کیسے ملے؟

صحیح اور سچل انتخاب ہی رکاوٹوں والی دیوار میں آپ کے لیے اک دروازہ کھولتا ہے تعلق بن جائے اور پھر مضبوط ہوتا رہے تو اس دروازے کے کواڑ بند نہیں ہوتے محبتیں ہی یہ کواڑ کھولتی ہیں اور ان کی کمی کی وجہ ہی سے یہ بند ہوتے ہیں خواہشات زندگی کی جڑ ہے خواہش ہوگی تو چن لینا آسان ہوگا۔

☆☆☆☆☆

حدیثِ دل

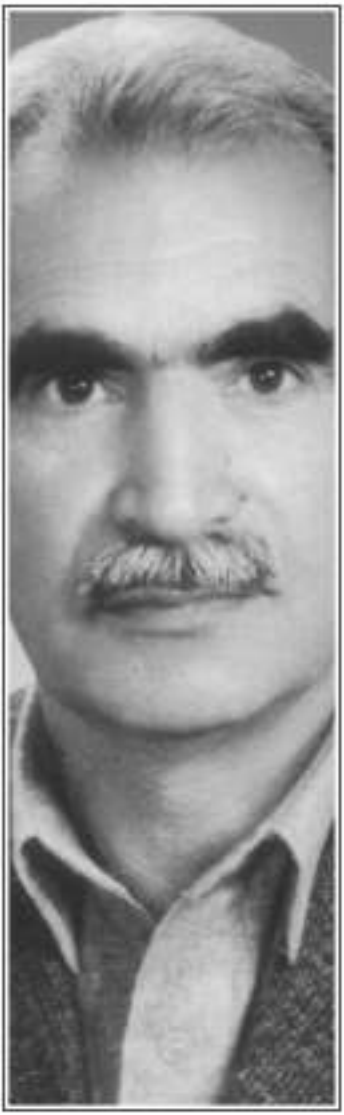

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے ست کہ بے آہ وفغاں نیز کنند

.....

وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ (قرآن) اللہ کا وہ اٹل قانون ہے جو روز الست سے تا روز حشر نافذ رہنے والا ہے۔ یہی اللہ کی سنت ہے اور (لاتبدیل لسنّۃ اللہ) " فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہ تَبدِیلاً" (قرآن)۔ بابلی، آشوری، فنقی، مصری، ایرانی، یونانی، رومی، عرب، مغول (منگول) اور ترک یکے بعد دیگرے طلوع وغروب ہوئے۔ ماضی قریب میں اہلِ یورپ دنیا پر چھائے رہے۔ حال میں مٹھی بھر یہودی بالواسطہ (امریکا) دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ جلد ہی چین ان سے یہ مقام چھیننے والا ہے۔ اللہ کا یہی قانون نچلی سطح پر ہر ملک، قوم، قبیلے، قصبے اور گاؤں تک میں نافذ او ررائج چلا آرہا ہے۔ خدا سب کا خدا ہے کوئی قوم اور قبیلہ اس کا چہیتا نہیں۔ حکومت کا وہ آہن گر (لوہار) کو بھی ملی جس کا پرچم، درفشِ کاویانی ایران کی تاریخ پر اب بھی لہرا رہا ہے، صفاریوں کو بھی ملی جو ٹھٹھیرے تھے اور دیالمہ (آل بویہہ) کو بھی جو مچھیرے تھے۔ ہر شاہی

محمد ارشاد

خاندان کا سلسلۂ نسب کسی عام آدمی پر منتج ہوتا ہے لیکن عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی خاطر اپنا نسب کسی دیوتا سے ملاتے رہے ہیں - فغفور (بغ پور) بغ (خدا) پور (بیٹا) یعنی خدا کا بیٹا قدیم دور میں بادشاہوں کے لیے خاص تھا۔ اسی بات کے زیر اثر مغربی یورپ میں جب دین عیسوی کو قبولیت حاصل ہوئی تو انھوں نے بھی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ باپ اور بیٹے کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے اس پر یونانی چرچ اور رومی چرچ یعنی آرتھوڈوکس اور کیتھولک چرچ میں افتراق آج تک موجود ہے۔ ہر دو گروہ مزید ذیلی فرقوں میں منقسم ہوئے۔ یہی حال دیگر ادیان کا بھی ہوتا آیا ہے۔ ہر بڑا دریا ابتدا میں چھوٹے چھوٹے ندی نالوں سے مل کر بنتا ہے اور سمندر میں گرتے وقت ڈیلٹا بناتا ہوا پھر کئی شاخوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہر بڑی تہذیب اور ہر بڑے تمدن کا بھی ہے۔ پھل جب پوری طرح پک جاتا ہے تو ساتھ ہی گلنا سڑنا بھی شروع ہو جاتا ہے یا تو اس میں کیڑے پڑنے لگتے ہیں یا پھر خود ہی درخت سے گر جاتا ہے:

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

.....

بزمانۂ عروج تہذیب و تمدن شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب ایک ساتھ بلندیوں پر ہوتے ہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں اسحاق موصلی اور اندلس میں اموی حکمرانوں کے دربار میں زریاب کے سے موسیقار موجود تھے۔ ہندوستان میں تان سین اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا۔ بعد میں شمشیر و سناں نے زنگ پکڑنا شروع کیا اور طاؤس و رباب نے شمشیر و سناں کی جگہ بھی لے لی۔ انگریزوں کے ممالک محروسہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ پانچوں براعظموں پر کہیں نہ کہیں حکومت تھی۔ Rule Britania-rule سب سے زیادہ مقبول نغمہ تھا۔ آج برطانیہ عظمیٰ میں شمالی آئرلینڈ کا ٹکڑا ان کے زیر نگین نہیں - پانچ براعظم انگریزوں نے فوجیں لا کر فتح نہیں کیے تھے کہ برطانیہ کی اتنی آبادی نہیں تھی کہ چنگیز خان کی طرح ٹڈی دل لشکر لاتے۔ تاجروں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں تھیں مقامی لوگوں سے فوجیں بھرتی کیں اور ان کی مدد سے پورا ملک فتح کرتے رہے۔ قسمت یاور تھی، میر جعفر، میر صادق اور میر رجب علی (۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا مخبر جس کی مخبری اور مدد سے آزادی کی خاطر لڑنے والوں کا ایمونیشن ڈپو تباہ کرنا ممکن ہوا اور

ان کا فتح یاب ہونا محال)۔ پورے برصغیر پر کل چھبیس سو (۲۶۰۰) انگریز حکمران تھے اور برصغیر کی کل آبادی تیس کروڑ تھی۔ انگریز کی آمد سے پہلے ہندوستان کبھی ایک ملک، ایک قوم نہیں رہا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور راجوڑے قائم تھے۔ اکبر کی سلطنت سے اورنگزیب کی سلطنت وسیع تر تھی لیکن جنوبی ہند کا بہت بڑا حصہ اس سے باہر تھا۔ انگریزوں نے اس حصے پر بھی تسلط قائم کر لیا حتیٰ گلگت بلتستان جو سلطنت کاشغر کا حصہ چلے آ رہے تھے اور ہندوستان کا کبھی حصہ نہیں رہے وہ بھی زیر تسلط آ گئے۔ شمالی ہند میں ہر طرف دندناتے پھرنے والے جاٹ، مرہٹے اور روہیلے ایسے سیدھے ہوئے کہ سارے کس بل نکل گئے۔ برہمن شودر، بھیل دراوڑ، سنی شیعہ بندگانِ بے دام وفادار رعایا بن گئے۔ یہی نہیں غلامی کو بھی اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگے:

یارب مجھے اس دیس میں پیدا کیا تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

....

انگریزوں کے یکایک چھوڑ جانے پر کئی لوگ علی الخصوص عوام نالاں تھے۔ اس لیے کہ ”اخلاقیات، راستی، رحم دلی کوئی قدر بھی ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی تھی۔ عام زندگی میں وہ رعایا کا خیال رکھتے۔ رشوت سے حتی الوسع اجتناب برتتے، سخت محنت کے عادی اور دیگر سامراجی طاقتوں کے برعکس رعایا کے مال کو جاگیر پدر نہ سمجھتے، انصاف کرتے۔ بشریت کے تقاضوں کے باوصف عام عورتوں پر ڈورے نہ ڈالتے۔“*

قانون کے طلبہ کو یہ واقعہ معلوم ہے کہ نواب جوناگڑھ کی بیگم نے غصے میں آ کر اپنی نوکرانی کے پیچھے مرچیں بھروا دی تھیں، انگریزوں کو معلوم ہوا تو نہ صرف نواب کو معزول کیا بلکہ بیگم کو بھی سزا دی۔ الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم (کوئی ملک کفر کے ساتھ تو رہ سکتا ہے ظلم کے ساتھ نہیں قائم رہ سکتا۔ حضرت علیؓ) ظلم عدل وانصاف کی نفی ہی تو ہے۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ دیر کو دیر تر کر دے تا کہ کرتا دھرتاؤں کو حالات کی سنگینی اور اپنی اصلاح کا وقت مل سکے۔ خلیل جبران نے کہا: افسوس ہے اس قوم پر جس کا ہر گروہ ایک قوم ہے۔ اللہ پاکستان کو قائم اور سلامت رکھے۔ آمین۔ لیکن اتحاد (اس پرچم کے سایے تلے ہم ایک ہیں،

---

*شاد داستان _ شوکت علی شاہ _ بیاض، اکتوبر ۲۰۲۱

ہم ایک ہیں) کے ترانوں سے نہیں آتا، عدل وانصاف سے آتا ہے۔ ناظم جوکھیو (صحافی) کی بیوہ کمسن اور معصوم بچوں کی نوجوان ماں کو اپنے خاوند کا خون معاف کرنا پڑتا ہے کہ رشتہ دار تک ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کہ مبادا وہ بھی مارے جائیں کیونکہ قاتل ایم این اے اور "بڑا آدمی" ہے۔ ایسے اور کتنے واقعات ہیں جو پیش کیے جاسکتے ہیں۔ امریکی شہری ریمنڈ ڈیوس دن دیہاڑے دو پاکستانیوں کو بیسیوں افراد کی موجودگی میں قتل کرتا ہے اور بچ کر امریکا پہنچ جاتا ہے اور وہاں ایک امریکی شہری سے جھگڑا کرتا ہے اور قانون اسے تین سال قید کی سزا دے دیتا ہے۔ نور مقدم کے قاتل ظافر کی پہلی ڈیفنس لائن یہ تھی کہ وہ امریکا کا شہری ہے (قانونِ پاکستان سے بالا ہے۔) کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں دو قانون ہیں ایک طاقتور اور زردار کے لیے اور ایک کمزور اور نادار کے لیے۔ قانون تو ایک ہی ہے البتہ اس کی تشریحیں ایک سے زیادہ ہیں۔ قانون دیت (خونبہا) بھی زرداروں کی مدد کو آجاتا ہے، مجرم امریکی ہو یا پاکستانی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں عمرو بن العاص مصر کے فاتح اور گورنر تھے۔ گھڑ دوڑ کے مقابلے میں ان کے بیٹے نے ایک عیسائی کا گھوڑا اپنے گھوڑے سے آگے نکلتے دیکھ کر عیسائی اور اس کے گھوڑے پر چابکوں کی برسات کر دی۔ عیسائی شکایت کرنے مدینہ آ پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ کو تحقیق کا کہا اور شکایت درست ہونے پر باپ بیٹے دونوں کو لانے کا حکم دیا۔ جب آئے تو عیسائی جسے روک رکھا تھا، کو نہ صرف عمرو بن العاص کے بیٹے کو کوڑے مارنے کا حکم دیا بلکہ عمرو بن العاص کو بھی کوڑے مروائے کہ وہ ان کا بیٹا نہ ہوتا تو غلط کام نہ کرتا۔ بیٹے کے جرم میں باپ بھی شریک ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کی بمباری سے لندن ملبے کا ڈھیر بن رہا تھا، گرتی عمارتوں کی گرد شعلوں اور دھوئیں اور کچھ نہ کر پانے سے ہر کوئی خوف و ہراس اور مایوسی میں مبتلا تھا۔ ونسٹن چرچل وزیر اعظم تھا۔ شکست متوقع تھی۔ کسی نے چرچل سے تشویش کا اظہار کیا تو چرچل نے پوچھا کیا ہماری عدالتیں انصاف نہیں کر رہیں؟ کہا، کر رہی ہیں تو چرچل نے کہا پھر فکر کی کوئی بات نہیں جیت برطانیہ کی ہے۔ سائل کا سوال بظاہر گندم اور چرچل کا جواب جَو لگتا ہے لیکن بات وہی ہے کہ کوئی ملک کفر کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے ظلم و ناانصافی کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ عدل کیا ہے؟ "وضع شیء

فی محلہ" اور ظلم کیا ہے؟ "وضع شیء فی غیر محلہ" یعنی عدل کسی شے کو اس کی Proper جگہ پر رکھنا ہے اور ظلم کسی شے کو improper جگہ پر رکھنا۔ اگر ایسا ہی ہے تو پاکستان میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ظلم نہ ہو رہا ہو۔ کیا جو شخص جس پوسٹ پر بیٹھا ہے واقعی اس کا اہل ہے؟ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو لے لیں جو لوگ پرائمری سکول کے مدرس بننے کے بھی اہل نہیں، پروفیسر لگے ہوئے ہیں۔ چہیتے طلبہ کا ان کی کارکردگی کی بنا پر نمبر دینے کے بجائے تعلق کو معیار بنانے والے اساتذہ، کسی کو انجینئر کسی کو ڈاکٹر کسی کو وکیل وغیرہ بننے میں مدد دے رہے ہیں۔ یہی طلبہ جب سیاست میں جاتے ہیں تو وہی ہوتا ہے جو ہوتا آیا ہے:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

.....

چرچل نے اپنی قوم کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا کہ جب تم ایک دوسرے سے ملو یا ایک دوسرے کے پاس سے گزرو تو پورا ہاتھ کھول کر سیلوٹ کرنے کے بجائے دو انگلیوں سے V (Victory) کا نشان بناتے ہوئے سیلوٹ کیا کرو۔ پاکستان میں معصوم بچوں اور بچیوں سے زیادتی اور پھر قتل کے مرتکب جب میڈیا کے کیمروں کے سامنے آتے ہیں تو وہ بھی V کا نشان بناتے ہیں۔ اسلام کے نام پر سیاست کرنے والے ہمیں بتاتے ہیں کہ ساری خرابی کی جڑ انگریزی قوانین ہیں ان کی جگہ اسلامی قوانین ہوتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ انہیں یوں سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ آزادی سے پہلے بھی تو یہی قوانین تھے اور لوگوں کو انصاف بھی ملتا تھا اور پھر کیا مغربی ممالک میں اسلامی قوانین رائج ہیں اگر نہیں تو پھر انصاف کیوں لوگوں کو مل رہا ہے۔ خرابی قوانین میں نہیں ہوتی ان کو نافذ کرنے والوں کی نیت میں کھوٹ ہو تو سب کچھ کھوٹا ہو جاتا ہے۔ کیا اودھ اور جنوبی ہند کی شیعہ ریاستوں میں فقہ جعفریہ اور شمالی ہند کی سنی ریاستوں میں فقہ حنفی رائج نہیں تھی؟ پھر کیوں استحکام پیدا نہیں ہوا اور انگریزوں کو تسلط کا موقع مل گیا۔ چنگیز خان اپنے آپ کو خدا کا قہر کہتا تھا جو بقول اس کے خدا کی زمین سے گند صاف کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اسی دور کے وقائع نگار ملک عطا جوینی نے 'تاریخ جہانگشائے' میں لکھا ہے کہ چنگیز خان کا ایک سپاہی دوران سفر اپنا بٹوہ راستے میں کہیں گرا گیا۔ آٹھ دن بعد اسے پیسوں کی ضرورت پڑی تو یاد آیا کہ بٹوہ راستے میں کہیں گر گیا تھا۔ جس راستے سے آیا اسی سے واپس گیا۔

آٹھ دن کے مزید سفر کے بعد اسے اس کا بٹوہ راستے میں پڑا مل گیا۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اسے اٹھاتا تو کیا کھول کر بھی دیکھتا۔ چنگیز خان کے قانون (تورۂ چنگیزی) میں جھوٹ بولنے اور پہرہ دار کے دوران پہرہ سو جانے کی سزا موت تھی۔ ایک پہرہ دار سوتے ہوئے پکڑا گیا۔ کسی مسلمان نے اسے مشورہ دیا کہ شکایت کرنے والے کے بارے میں کہہ دو کہ وہ مجھ سے ذاتی رنجش رکھتا ہے اور جھوٹا الزام لگا رہا ہے تو پہرے دار نے کہا میں مسلمان نہیں کہ جھوٹ بولوں۔ ایک سچے نبی کے امتی کی ایک کافر کو جھوٹ بولنے کی ترغیب و تلقین، وہ نبی جس نے جھوٹ کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ چنگیز خان نے اپنے ایک بیٹے کو قانون کی خلاف ورزی پر اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا اور وہ وہیں مر گیا۔

استاد اجل شیخ سعدی شیرازی کے استاد شیخ عبدالرحمان ابن جوزی (جن کا ذکر سعدی نے بڑے ادب و احترام سے گلستان میں کیا ہے اور ابن جبیر الاندلسی نے بھی جو سفر حج کے موقع پر بغداد سے گزرے تھے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے) نے 'کتاب الاذکیا' میں ایک قاضی (جج) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر دوسری شادی کر رکھی تھی۔ فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد بھی گھر نہ آتا یا آنے میں دیر کر دیتا اور دوسری بیوی کے پاس چلا جاتا۔ جسے کسی دوسرے گھر میں رکھ رکھا تھا۔ پہلی بیوی کو شک ہوتا اور اس کا اظہار بھی کرتی تو حیلے بہانوں سے ٹال دیتا۔ لیکن یہ ایک دن کی بات تو نہیں تھی۔ آخر قاضی کو ایک ترکیب سوجھی۔ دونوں بیویوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا، اپنی دوسری بیوی سے کہا کہ فلاں دن میرے گھر آجاؤ اور میری پہلی بیوی کی موجودگی میں یہ شکایت کرو کہ میرے خاوند نے دوسری شادی کر رکھی ہے اور مجھ سے یہ بات چھپا رکھی ہے، اس کا ذکر کرتی ہوں تو کہتا ہے کہ تمھیں یونہی شک ہو رہا ہے۔ دوسری بیوی آئی تو پہلی بیوی کی موجودگی میں وہی کیا جو اسے بتایا گیا تھا۔ قاضی نے کہا کہ تم عورتوں کو اپنے خاوندوں پر یونہی شک ہوتا رہتا ہے۔ اب یہ میری بیوی (پہلی) ہے اسے بھی اسی طرح کا شک مجھ پر ہے۔ دیر سے آؤں تو جھگڑا کرنے لگتی ہے۔ میں آج تم دونوں کے سامنے واشگاف طور پر کہتا ہوں کہ اس گھر سے باہر میری کوئی اور بیوی ہو تو طلاق طلاق طلاق۔ پہلی بیوی بھی مطمئن ہو گئی اور دوسری بھی اس گھر کو روانہ ہو گئی جہاں قاضی نے اسے رکھ رکھا تھا۔

جھوٹ بھی "وضع شئ فی غیر محلہ" ہے اور ظلم ہے عدم انصاف و عدل ہے۔ جھوٹ جب سکہ

رائج الوقت ٹھہرے تو پورا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ قہر الٰہی کی کوئی ایک صورت نہیں۔ چنگیز خان بھی قہر الٰہی کی صورت تھا جو ایک decadent تہذیب پر نازل ہوا۔ انگریز بھی قہر الٰہی کی ایک صورت تھے "وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا" (جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہاں کے مرفہ الحال لوگوں کے دل میں ایسی بات ڈال دیتے ہیں کہ وہ فسق و فجور کرنے لگتے ہیں چنانچہ وہ بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے اور ہم اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ (سورۂ بنی اسرائیل)۔ بظاہر یہ بات عجیب لگتی ہے کہ عوام الناس خوشحال طبقات کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یوں پوری بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ انگریز ظالم لیکن عادل حکمران تھے۔ بظاہر یہ دو متضاد باتیں لگتی ہیں۔ لیکن ایسا نہیں۔ ظالم اس وجہ سے کہ اپنے آپ کو رعایا سے برتر سمجھتے تھے۔ اپنے لیے مخصوص جگہوں حتیٰ کہ ٹرین کے ڈبوں پر یہ لکھوا رکھا تھا Indians and dogs are not allowed جس طرح کی مساوات ان کے اپنے اندر قائم تھی اسی طرح کی مساوات رعایا میں قائم رکھی۔ برہمن شودر، بھیل بھنگی، راجا پرجا، وڈیرا ہاری، نواب قصاب، ہندو مسلم سکھ عیسائی سب انڈین:

ایک ہی صف میں کھڑے "کر دیئے" محمود و ایاز

جرمن فلسفی نیطشے جس کی سی ژرف نگاہی کسی دوسرے فلسفی کو حاصل نہیں نہ اس سے پہلے نہ اس سے بعد کہتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کوئی قوم فلاں فلاں کام کرے گی تو تباہ ہو جائے گی لیکن میری برتر حس (higher Sense) کا کہنا یہ ہے کہ کسی قوم نے تباہ ہونا ہوتا ہو تو وہ فلاں فلاں کام کرے گی یعنی جسے cause سمجھا جاتا ہے کہ وہ effect ہے اور جسے effect سمجھا جاتا ہے وہ cause ہے۔ نیطشے کے قول کو قرآن کی آیت (اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً.....) کی ذیل میں پڑھا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو شخص عیسائیت کے جرائم میں سب سے بڑا جرم سپین میں مسلمانوں کی تہذیب کی تباہی کو قرار دیتا ہو اور عیسائی اخلاقیات کو نسوانی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کو مردانہ اخلاقیات ٹھہراتا ہو اور یہ کہتا ہو کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو اہل مغرب کے مزاج کے عین مطابق ہے، قرآن پڑھنے سے محروم رہا ہو۔ اگر ہم

قرآن کی محولہ بالا آیت اور نیطشے کے قول سے استفادہ کرتے ہوئے ہندوستان کے معاشرے پر نظر ڈالیں تو بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔ اقبال کے شمشیر و سناں اول اور طاؤس ورباب آخر کے درست مفہوم سے بھی آگاہی ہو جائے گی ۔ اکبر سے اورنگزیب تک شاہان تیمور کو وہ شان و شوکت حاصل رہی جس کی مثال نہیں ملتی انگریز اورنگزیب کے زمانے میں بھی ہندوستان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے بعد محلاتی سازشوں اور رنگ رلیوں کا دور شروع ہو گیا۔ جہاندار شاہ ایک انتہائی خوبرو اور خوش گلو ڈومنی کا شہرہ سن کر اسے محل میں لے آیا اور اسے امتیاز محل کا خطاب دے کر ملکہ بنالیا۔ امتیاز محل (لال کنور) اس سے پہلے جہاندار شاہ کے بھانجے جواں بخت کی داشتہ رہ چکی تھی، اس سے پہلے کئی اور شہزادوں کی۔ اس کے بھائی بند ڈوموں ڈھاریوں کو اعلیٰ فوجی مناصب پنج ہزاری ہفت ہزاری پر فائز اور مناصب کے مناسب جاگیریں عطا کی گئیں:

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

.....

ہر طرف نغمہ و سرود، شراب و کباب کی محفلیں، جہاندار کو اس کے بھتیجے فرخ سیر نے قتل کر کے تخت خود سنبھال لیا لیکن جہاندار شاہ کی سنت کو جاری رکھا۔ سید برادران نے اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اندھا پھر قید کر دیا پھر دو شہزادے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ یکے بعد دیگرے جانشین کیے گئے۔ اول الذکر عیاشی و بدقماشی کی وجہ سے سل کا مریض تھا چار ماہ بعد فوت ہو گیا اور دوسرا بھی تین ماہ بعد جو تیرہ سال کی عمر میں دس بیویوں کا شوہر تھا۔ محمد شاہ تو تھا ہی رنگیلا، وہی رنگیلا جس نے نادر شاہ کا دلی کے جوار میں ہونے کا سن کر کہا "ہنوز دلی دور است":

شہ مست و جہاں خراب و دشمن پس و پیش
پیداست ازیں میاں چہ خواہد برداشت

.....

یہی حال نوابانِ اودھ کا جو شاہان تیمور کے صوبیدار (نواب نائب کا اسم تفضیل جیسے فاعل سے فعّال) تھے۔ جو انگریزوں کے اشارے پر شاہ کہلوانے لگے تھے کا بھی تھا۔ ان میں سے ایک ہر ماہ دروزہ میں مبتلا ہو کر کسی امام کو جنم دیتا، زچہ کی خوراک کھاتا، پہلو میں لٹائی گڑیا (نومولود امام) سے پیار کرتے نہ تھکتا۔ واجد علی شاہ (اختر پیا) راگ راگنیوں کے بول تصنیف کرنے میں مشغول رہتا۔ عوام بٹیروں کی پالیاں جما کر جنگ کا شوق پورا کر لیتے۔ بٹیروں کے نام صف شکن خاں ٹھہرے۔ جنوبی ہند کا تانا شاہ ہاتھی پر سوار بازار سے گزر رہا تھا کہ

ہاتھی کے پاؤں تلے مولی کا پتا آ گیا۔ تانا شاہ نزلہ وزکام میں مبتلا ہو گیا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں ایک بادشاہ ناصر الدین قباچہ کا ذکر کیا جو تالاب میں نہانے کے بعد سیڑھیاں چڑھتے وقت دو رویہ کھڑی دوشیزاؤں کی چھاتیاں پکڑ کر اوپر آتا۔ جہانگیر نے اس کی قبر پر جوتے مارنے کا حکم دیا۔ سارے سنی شیعہ حکمران اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاس (خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا جو لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے کسب کیا) اس decadent معاشرے پر موقع ملتے ہی انگریز، پرتگیز اور فرانسیس جھپٹ پڑے۔ آخر آخر پورے برصغیر کی ۳۸ کروڑ عوام پر چھبیس سو انگریز حکومت کر رہے تھے۔ ۳۸ کروڑ بقول جمال الدین افغانی مل کر پیشاب بھی کرتے تو انگریز ڈوب جاتے۔ لیکن اللہ کا قانون اٹل ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِاَنْفُسِهِم" اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔ (قرآن) مولانا ظفر علی خان کا یہ شعر اسی آیت کا ترجمہ ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلے گی جب تک تعلیمی اداروں کی حالت نہیں بدلے گی۔ جس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ میرا ایک پوتا لاہور کے ایک بہت اچھے سکول میں پڑھتا تھا۔ بہت اچھا سپورٹس مین ہی نہیں کلاس کا ہیڈ بوائے بھی تھا اور تعلیم میں نمایاں۔ انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتا ہے۔ اس نے اپنی سات Poems سکول میگزین کے لیے دیں۔ ایک انگریزی کے استاد نے اپنے نام سے چھپوا دی اور پانچ سینئر لڑکوں کے نام سے صرف ایک ساتویں کلاس کے اس بچے کے نام سے۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو بھی کیمبرج سکول سسٹم (انٹرنیشنل) کے سکول میں O لیول میں داخل کروا دو۔ بچہ اسی سکول میں رہا تو بے ایمانی کے سوا کچھ نہیں سیکھ پائے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جس ملک میں نصاب تعلیم تک سیاستدان کی سیاسی مصلحتوں کے زیر اثر ہو اس ملک کے طلبہ کے فکر ونظر میں کسی انقلاب کی توقع جنت الحمقا میں رہنا ہے۔ پاکستان سٹڈیز کو یونیورسٹی لیول تک ہر مضمون کے طالب علم کے لیے لازمی تو ہے ہی، انجینئرنگ اور ایم بی بی ایس تک کے طلبہ کے لیے لازمی بھی ہے، اور اس میں کیا

ہے ایک سیاسی جماعت کی تاریخ جواب کئی جماعتوں میں منقسم ہے اور ان میں سے ہر ایک قائد اعظم کی حقیقی وارث ہونے کی مدعی۔ آزادی کی جدوجہد میں احرار بھی شامل تھے اور خاکسار بھی۔ پھر چوہدری رحمت علی کا نام کیوں نہیں جو پاکستان کی تحریک کا اصل بانی تھا۔ جب لندن میں گول میز کانفرنسیں ہو رہی تھیں اس وقت مسلم زعما بھی چوہدری رحمت علی کے پمفلٹ کو کیمرج یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ کا شوشہ کہتے تھے۔ قائداعظم تو متحدہ ملک پر بھی ایک فارمولے کے تحت راضی ہو گئے تھے۔ خدا بھلا کرے جواہر لال نہرو کا جس نے کہا آئین جیسا بھی بنا ہندو اکثریت میں ہیں تبدیل کر دیں گے۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ قائد اعظم نے تقسیم کا مطالبہ کر دیا اور اپنی بات منوا کر رہے۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ تقسیم مسلمانان ہند کی تاریخ کا بہت مشکل سوال تھا۔ جن مسلمانوں نے قائد اعظم کے موقف سے الگ موقف اختیار کیا انھیں برا بھلا نہیں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کے دشمن وہ بھی نہیں تھے۔ تقسیم کے مخالفین میں مولانا آزاد کے علاوہ ایک اہم نام مولانا حسین احمد مدنی کا بھی تھا۔ جن کے موقف کا اقبال نے بھی نوٹس لیا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیت
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست
بمصطفےٰ برساں خویش را دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

.....

اگر اقبال زندہ رہتے اور دستور ساز اسمبلی میں قائد اعظم کی ہی تقریر (۱۱ اگست ۴۷ء) سنتے

We should keep that In front of us and you will find that in the course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims not in the religious sense because that is the personal faith of each individual but in the political sense of the nation as one.

تو کیا ردعمل ہوتا کہ قائداعظم بھی وہی کہہ رہے تھے جو حسین احمد مدنی کہتے تھے۔ اقبال کا موقف تو یہ تھا:

بتانِ آرزو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

اور یہی تعلیم بھی:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

....

پھر یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ اقبال کے خواب کو قائداعظم نے عملی جامہ پہنایا۔ جس پاکستان میں ہم رہ رہے ہیں وہ تو قائداعظم کی توقعات کے مطابق بھی نہیں ہے۔ اسی دستور ساز اسمبلی میں قائداعظم نے کہا تھا:

... black-marketeers are punished according to our judicial system. Now you have to tackle this monster a crime against society in our distressed conditions, in our shortage of foods and essential commodities of life, They ought to be severely punished... The next thing that strikes me is nepotism and jobbery... I want to make it quite clear that I shall never tolerate jobbery, nepotism or any influence direct by or indirectly brought to bear upon me.

قائداعظم کو کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد بلیک مارکیٹیے، ذخیرہ اندوز، کنبہ پرور اور سفارشیے برسراقتدار رہوں گے۔ یہ حال دیکھ کر ہی محترمہ فاطمہ جناح نے کہا کہ میرے بھائی کو معلوم ہوتا تو پاکستان کبھی نہ بناتے۔ خوش قسمت تھیں پاکستان کو دو ٹکڑے ہوتے نہیں دیکھا۔ پھر جو ہوا اور ہو رہا ہے:

زمانٌ قد تَفَرَّغَ لِلْفُضولِ
وَسَوَّدَ کُلَّ ذی حُمقٍ جَهولٍ

(زمانہ ناکارہ لوگوں کے لیے اپنا دامن کشادہ رکھتا ہے۔ اجڈ گنوار اور احمقوں کو لیڈر بنا دیتا ہے)

....

قائداعظم کی "جیب کے کھوٹے سکے" کھرے ہو کر سکہ رائج الوقت ٹھہرے۔

قائداعظم کی مسلم لیگ محلاتی سازش، لیگ بن گئی۔ بیوروکریٹ اور لینڈ لارڈز مسلم لیگ پر قابض ہو گئے۔ خواجہ ناظم الدین کا کہنا تھا کہ جب میں گورنر جنرل تھا تو سارے اختیارات وزیر اعظم (نوابزادہ لیاقت علی خان) کے پاس تھے اور جب میں وزیراعظم تھا تو سارے اختیارات گورنر جنرل (غلام محمد، بیوروکریٹ) کے پاس تھے۔ اپنی برطرفی کی خبر ریڈیو پر سنی۔ خواجہ ناظم الدین کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا، لیاقت علی ریاست کرنال کے نواب مہاجر اور غلام محمد کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا۔ لیاقت علی خان کو کرنال سے بڑی ریاست حکمرانی کے لیے مل گئی تھی۔ صرف قائد اعظم کی موت کا انتظار تھا۔ قائداعظم نہ لینڈ لارڈ تھے نہ بیوروکریٹ نہ مہاجر کراچی میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہیں فوت اور یہیں دفن بھی ہوئے۔ اعلیٰ پائے کے قانون دان تھے۔ پوری مسلم لیگ میں ان کا سا اصول پسند، جری، ذہین وفطین، قانون دان کوئی اور نہ تھا۔ اگر ہندوؤں کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ ایسے مہلک مرض میں مبتلا ہیں کہ سال سوا سال سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے تو پاکستان کبھی نہ بنتا یعنی ہندوستان تقسیم نہ ہوتا۔ لیکن قائداعظم کے کارنامے میں ڈنڈی مارے جانے لگی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے فرمایا: پاکستان اردو نے بنایا ہے۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ پاکستان وہاں کیوں نہیں بنا جہاں اردو بولی جاتی تھی۔ چوہدری رحمت علی کے مجوزہ پاکستان میں تو اردو بولنے والے صوبے بھی شامل تھے۔ تحریک پاکستان کے آغاز کنندہ بھی وہی تھے۔

موجودہ پاکستان تو اس وقت بھی ”پاکستان“ تھا جب نہ اردو بولنے والے تھے نہ اردو بولنے والے صوبوں میں مسلمانوں کا نام ونشان تھا۔ عربی کتب تواریخ وجغرافیہ میں السند والہند کا ذکر ملتا ہے۔ سندھ اور ہندو الگ ملک تھے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ۔ عربی ادب کی تاریخ میں ابوالعطا الہندی کا نام بھی موجود ہے جو مخضرین شعرا (جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا) میں ایک تھے۔ سندھ کا پہلا فاتح محمد بن قاسم (بزمانہ بنو امیہ) نہیں۔ الحکم بن العاص ثقفی (بزمانہ، حضرت عمرؓ) ہے۔ الدیبل من ناحیۃ السند...... وَجَّهَ الیہ عثمان بن العاص اَخاہُ الحکم ففَتَحہٗ (یاقوت حموی)۔

حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں مکران (بلوچستان) بھی فتح ہوا، اور خیبر پختونخوا حضرت عثمان کے دور میں۔

اس دور کے مفتوحہ شہروں میں ایک شہر بنّو (Bannu) کا نام بھی عربی کتب تواریخ میں موجود ہے، جسے آج کل بنوں لکھا جاتا ہے۔ بنوچی اب بھی اسے بنّو ہی بولتے ہیں ایک صحابی کی قبر میرے گاؤں میں موجود ہے۔ صاحب قبر کا نام تو کسی کو معلوم نہیں البتہ صاحب قبر کو پیر اصحاب غازی کہا جاتا ہے اور جگہ کو پیر صحابہ۔ ایسی ہی ایک قبر پشاور میں بھی ہے۔ رہا مغربی پنجاب تو ممکن نہیں کہ پڑوس میں ہونے کی وجہ سے پٹھوہار اور ضلع اٹک میں عوام نے اسلام قبول نہ کیا ہو اور وہاں سے پنجاب کے دیگر ملحقہ اضلاع کے لوگوں نے پس یہ سارا خطہ اسلامستان تھا۔ سن ۴۷ء حد بندی کا اور پاکستان نئے نام کا سال ہے۔

وہ زبان جسے آج کل اردو کہا جاتا ہے نئی زبان نہیں، ہندوستان میں بولی جانے والی قدیم زبانوں میں ایک ہے۔ خواجہ امیر خسرو نے ان زبانوں کی یہ فہرست دی ہے۔ (۱) سندھی۔ (۲) لاہوری (۳) کشمیری (۴) بنگالی (۵) کوڑی (۶) گجراتی (۷) تلنگی (۸) کرناٹکی (۹) دھور سمندری (۱۰) اودھی (۱۱) دہلوی۔ ابوالفضل نے تین سو سال بعد یہ فہرست دی۔ (۱) دہلوی (۲) بنگالی (۳) ملتانی (۴) گجراتی (۵) مرہٹی (۶) تلگو (۷) سندھی (۸) کرناٹکی (۹) افغانی (۱۰) بلوچی (۱۱) کشمیری۔ یہ وہ زبانیں ہیں جو اپنے اپنے دور کے مسلمان حکمرانوں کے زیر تسلط علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔ اور مسلمانوں کی آمد سے پہلے سے رائج تھیں۔ ان میں نہ اردو کا نام ہے نہ ہندی کا۔ پس اردو اور ہندی وہی دہلوی ہے، فرق رسم الخط فارسی اور دیوناگری کا ہے، جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے تھے، اب بھی بولتے ہیں۔

کوئی زبان دوسری زبانوں کے دخیل الفاظ سے کوئی اور زبان نہیں بن جاتی۔ جتنے دخیل الفاظ دہلوی میں ہیں اتنے ہی پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی میں بھی ہیں۔ سب سے زیادہ دخیل الفاظ انگریزی میں ہیں۔ عربی بھی دخیل الفاظ سے محفوظ نہیں جس کے بولنے والے دیگر زبانوں کے بولنے والوں کو عجمی (گونگے) کہتے ہیں۔ جلال الدین سیوطی نے ایسے ایک بیس دخیل الفاظ کی فہرست دی ہے جو قرآن میں موجود ہیں لیکن عربی عربی ہے، انگریزی انگریزی، پشتو پشتو، پنجابی پنجابی، دہلوی (ہندی) دخیل الفاظ سے نئی زبان 'اردو' کیسے بن گئی۔ کیا اس کے پیچھے مسلمانوں کی اقلیت ہونے کا خوف احساس کمتری کو احساس برتری میں بدلنے کی کوشش

کا رفرما نہیں سمجھی جانی چاہیے۔ دہلوی کو 'اردو' کا نام دینا خود فریبی ہے یعنی لشکر کی زبان، شگفت انگیز یہ کہ اردو میں لشکر کو اردو کبھی نہیں کہا گیا۔ کسی نے کبھی پڑھا کہ بابر کی اردو نے رانا سانگا کی اردو کو اور اکبر کی اردو نے رانا پرتاب کی اردو مار مار بھگایا۔

قائد اعظم کو تو اتنی اردو بھی نہیں آتی تھی جتنی افغانستان کے گلبدین حکمت یار کو آتی ہے۔ مادری زبان گجراتی کے علاوہ کسی اور زبان پر عبور تھا تو انگریزی زبان پر اور انگریزی پر دسترس کی وجہ سے انھوں نے تقسیم پر انگریزوں کو قائل کر کے پاکستان کو حاصل کیا۔ اردو نے پاکستان نہیں بھی بنایا تو بھی اردو نے پاکستان کو دولخت کرنے کی بنیاد رکھی وہاں بچ گئے ہوئے پاکستان میں مختلف زبانیں بولنے والوں کی باہمی اجنبیت ختم کر کے یگانگت قائم بھی کی۔ تمام زبانیں بنی آدم کی ہیں۔ انگریزی نے مختلف اقوام کو مزید ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ اسے ترک کرنا پوری دنیا سے قطع تعلق تو ہے ہی، یہ سائنس کی زبان بھی ہے۔ اردو اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اردو میں الفاظ و اشیا تک مذکر مؤنث ہیں۔ روٹی مؤنث ہے پانی مذکر، میں جا رہا ہوں، میں جا رہی ہوں کے لیے ایک ہی فقرہ ہے۔ صرف فارسی وہ زبان ہے جو نہ صرف آسان ترین ہے بلکہ اس میں اشیا اور افعال تک کے مذکر مؤنث ہونے کا کھکھیڑ موجود نہیں - ہندوؤں نے انگریزی کی اہمیت کا احساس مسلمانوں سے پہلے کیا اور وہ سائنس کے میدان میں ہم سے آگے بڑھ گئے۔ ایسٹرانومی میں چندر شیکھر ایفیکٹ انہی کی دین ہے۔ جب کہ مسلمان سرسید کی کوشش کے باوصف یہی گمان کرتے رہے کہ انگریزی سکھا کر ہمیں کرسٹان بنانا چاہتے ہیں - اگر سائنس کے میدان میں دیگر مسلمان ممالک سے آگے ہیں تو وجہ انگریزی ذریعہ تعلیم ہے - ہندوستان کو آزادی سے ہمکنار بھی انگریزی دان زعما نے کروایا، اردو دان زعما نے تو تحریک ریشمی رومال بھی چلائی تھی جو ناکامی پر منتج ہوئی۔ قائد اعظم انگریزی پر عبور نہ رکھتے تو کیا پاکستان کے حق میں انگریزوں کو قائل کر پاتے۔ دیگر عوامل میں انگریزی نہایت اہم عامل تھی جس سے پاکستان، تقسیم کی راہ ہموار ہوئی۔ قائد اعظم ایک فارمولے کے تحت متحدہ ہندوستان پر بھی راضی ہو گئے تھے اگر جواہر لال نہرو یہ نہ کہتے کہ آئین جیسا بھی بنا ہم اکثریت میں ہیں تبدیل کر دیں گے۔ بلی تھیلے سے باہر۔

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

.....

یہ دوسرا بڑا عامل تھا۔ قائداعظم تقسیم کے مطالبے پر ڈٹ گئے۔ تیسرا بڑا عامل کا قائم کردہ جاگیرداری نظام تھا۔ جاگیریں پہلے بھی موجود تھیں لیکن موروثی نہیں تھیں۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ ایک جاگیردار کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا یا اور کوئی وارث جاگیردار بن جاتا۔ ساری زمینیں سٹیٹ لینڈ تھیں۔ یہ قانون حضرت عمرؓ کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ زمین نہ کوئی بیچ سکتا تھا نہ خرید سکتا تھا۔ جاگیردار کا کام مرکز کو لگان اور سپاہ فراہم کرنا ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے طے شدہ رقم اپنے پاس رکھ کر بیت الامال اور شخصی حکومتوں کے دور میں شاہی خزانے میں بھیج دیتا۔ انگریزوں نے جاگیریں موروثی بنا کر جاگیرداروں کی ملکیت میں دے دیں۔ اپنے ہاں کی لینڈ لارڈ اور Serf کی تقسیم یہاں بھی قائم کر دی۔ نواب (نائب کا اسم تفضیل جسے فاعل سے فعّال) جو صوبیدار یعنی گورنر تھے اپنے آپ کو بادشاہ اور عوام کے جان و مال کا مالک سمجھنے لگے۔ لینڈ لارڈز اور بڑے زمینداروں کا یہ طبقہ انگریزوں کا احسان مند اور دل و جان سے وفادار تھا۔ دوسرا طبقہ ان علمائے دین کا تھا جو یہ کہتے تھے کہ چونکہ انگریز ہمارے دین میں مداخلت نہیں کرتے اس لیے ان کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ تیسرا وفادار طبقہ مشائخ کا تھا جو بزبان اقبال نشۂ طرزِ سرکار سے مست تھے۔ اپنے خلاف آئے دن کے مظاہروں سے زچ ہو کر انگریزی ہوم رول دینے پر راضی ہو گئے۔ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت ہندوؤں، شیڈیوں کاسٹس، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے لیے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں سیٹیں مختص کر دی گئیں۔ ۱۹۳۷ کے انتخابات میں مسلمانوں کے لیے مخصوص ۴۸۵ نشستوں میں سے صرف ایک سو نو (۱۰۹) پر مسلم لیگ کامیاب ہو سکی۔ بنگال کی ۱۱۷ مخصوص سیٹوں میں سے ۴۰ پر پنجاب کی ۸۶ مخصوص سیٹوں میں ۲ پر، سندھ کی ۳۶ اور سرحد کی بھی ۳۶ سیٹوں میں سے کوئی ایک بھی نہ جیت پائی۔ البتہ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، کامیاب رہی۔ مجموعی طور پر کامیابی انتہائی مایوس کن تھی۔ اس وقت بھی مسلم لیگ کے سربراہ محمد علی جناح ہی تھے۔ دوسری بار ۱۹۴۵ میں انتخابات ہوئے تو نتائج حیران کن تھے۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی مجموعی ۵۵۳ مسلمان مخصوص سیٹوں میں ۴۶۰ مسلم

لیگ نے جیت لیں۔ کانگریس کے ٹکٹ ہولڈر مسلمان امیدوار ضمانتیں تک نہ بچا پائے۔ ووٹوں کی برسات دیدنی تھی۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

.....

ووٹوں کی برسات سے جنگل کا جنگل یونہی ہرا نہیں ہوا۔ کانگریس کے منشور میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد تمام جاگیریں، نوابیاں، راجواڑے ریاست کی ملکیت میں دے دیئے جائیں گے۔ مسلم لیگ کے منشور میں ایک ایسی کوئی خطرناک شق موجود نہیں تھی۔ چنانچہ پاکستان کے حق میں پہلی قرارداد سندھ اسمبلی میں پاس ہوئی اس سندھ اسمبلی سے جس میں ۳۶ اراکین میں ۳۷ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کا کوئی رکن موجود نہیں تھا۔ پنجاب کے اراکین بھی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آن کھڑے ہوئے۔ سرحد کے ۳۶ میں سے بھی ۱۷ پر مسلم لیگ جیت گئی۔ بلوچستان کمشنری تھا وہاں الیکشن نہیں ہوئے۔ پاکستان سندھ، پنجاب، بنگال اور سرحد کے لینڈ لارڈز نے بنایا۔ وہی لوگ آج بھی پاکستان کے حکمران ہیں، جن کی گائیں اور بھینسیں سکولوں اور کالجوں میں بندی جگالی کرتی رہتی ہیں۔ اگر کہیں ایسا نہیں تو خیبر پختونخوا اور بلوچستان ہیں۔

پاکستان بنایا بھی سندھ اور پنجاب کے لینڈ لارڈز نے اسے دو ٹکڑے بھی انھوں نے ہی کیا۔ شروع شروع میں مشرقی پاکستان کو ایک الگ اور مستقل آزاد ریاست کے طور پر وجود میں آنا تھا لیکن وہاں کے لوگوں نے ایک متحد ریاست کا شہری بننے کو ترجیح دی۔ یہ پہلی قربانی تھی۔ مغربی حصے اور مشرقی حصے میں ایک ہزار میل کی دوری تھی، اس میں بھی بھارت حائل تھا:

پاکستان بین المشرق والمغرب

.....

سمندری راستے سے تین ہزار میل کی دوری اس میں بھی بھارت حائل اس کے علاوہ تھی۔ پاکستان بننے کو تو بن گیا لیکن مملکت خداد، ۱۹۳۵ کے انڈیا ایکٹ پر چلتی رہی۔ گورنر جنرل تاج برطانیہ کا نمائندہ تھا، آئین بنتا تو یہ تعلق ٹوٹ جاتا۔ بھارت نے ایک سال کے اندر اندر آئین بنالیا ہم نو سال تک اس امید میں رہے کہ شاید انگریز ہمیں دوبارہ اپنے سایہ عاطفت میں لے لیں۔ مایوس ہوکر آئین بنانا پڑ گیا۔ ''مصیبت'' یہ تھی کہ مشرقی حصے کی آبادی مغربی حصے کی آبادی سے ایک کروڑ زیادہ تھی۔ ڈر تھا کہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مشرقی حصے کے لوگ حکومت کرنے نہ لگ

جائیں۔ مغربی حصے کے چار صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ ''مغربی پاکستان'' بنا دیا گیا اور مشرقی بنگال، مشرقی پاکستان۔ قومی اسمبلی میں برابر کی نمائندگی کی بنیاد پر ۵۶ء کا آئین وجود میں آیا۔ یہ دوسری قربانی تھی جو پاکستان کو متحدہ رکھنے کی خاطر بنگالیوں نے دی۔ آئینی طور پر ایک کے دو پاکستان بن گئے۔ سرزمین بے آئین کو آئین مل گیا، جس کی بنیاد اکثریت کی نفی تھی، جمہوریت کی پامالی:

رنگ کو دھوپ کھا گئی بُو کو ہوا اُڑا گئی
کیسے اس اعتبار سے آئی بہار یا گئی

.....

چوہدری محمد علی کا یہ آئین دو سال چلا، ۴۷ء سے لے کر ۵۸ء تک اور مارشل لاء کے ادوار کو چھوڑ کر آج تک:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

.....

قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں یہ بیوروکریٹس، غلام محمد، چوہدری محمد علی، سکندر مرزا سیاستدان بن گئے۔ ان کے اور ارسٹوکریٹس (لینڈ لارڈز) کے درمیان میوزیکل چیئرز کا کھیل شروع ہو گیا۔ حکومتوں کا دورانیہ ہفتوں اور مہینوں تک پہنچ گیا۔ بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے طنزاً کہا میں اتنی جلدی دھوتیاں بھی نہیں بدلتا جتنی جلدی پاکستان میں حکومتیں بدلتی ہیں۔ صدر سکندر مرزا نے کھیل ختم کرتے ہوئے ۵۸ء میں مارشل لاء لگا دیا:

وقت کیا شے ہے پتہ آپ کو چل جائے گا
ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھو گے تو جل جائے گا

.....

بیس دن بعد ایوب خان نے سکندر مرزا کو چلتا کر دیا اور اقتدار خود سنبھال لیا۔ سیاستدانوں کو بن باس لینا پڑ گیا۔ لیکن:

تو خواہی آستیں افشاں وخواہی زُوے درہم کش
مگس جائے نہ خواہد رفتن از دُکانِ حلوائی

.....

موقعے کی تلاش میں رہے۔ ایوب خان نے ۶۲ء کا آئین دیا، نمائندگی برابر رہی۔ اُس پار کے پاکستانیوں کی قسمت نہیں بدلی۔ بڈھ بیر پشاور کی ایئر بیس امریکہ کی تحویل میں تھی جہاں پاکستانی بڑے سے بڑا عہدیدار بھی بلا اجازت نہیں جا سکتا تھا۔ یہیں سے امریکہ کے u2 جاسوسی طیارے سوویت یونین پر پرواز کرتے۔ امریکیوں کا خیال تھا کہ ساٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنے والے طیارے کو گرانے کے لیے سوویت یونین کے پاس ٹیکنالوجی نہیں تھی لیکن انھوں نے مار گرایا۔ خروشچف نے کہا ہم نے پشاور کے گرد سرخ دائرہ کھینچ دیا ہے۔ میعاد

معاہدہ جو پہلے سے چلا آ رہا تھا، ختم ہوئی تو ایوب خان نے تجدید نہیں کی۔ یہ پہلا ایسولیوٹلی ناٹ تھا، ساتھ "فرینڈز، ناٹ ماسٹرز" بھی شائع کروا دی۔ نیبی اشارہ پاتے ہی بن باسیوں کو بن باس ختم ہونے کی امید لگ گئی۔ مظاہرے شروع ہو گئے، جن کا خاتمہ یحییٰ خان نے مارشل لاء لگا کر کر دیا۔ اقلیم کی باگ پکڑتے ہی اقلیم اختر (جنرل رانی) بلیک بیوٹی اور ملکۂ ترنم کی معیت میں غرق مے ناب اولیٰ شعار ٹھہرا۔ اتنا ضرور کیا کہ ۷۵ سالہ تاریخ پاکستان میں پہلی اور آخری بار منصفانہ انتخابات کروائے۔ قومی اسمبلی کی تین سونشستوں میں سے ۱۶۹ عوامی لیگ نے اور ۸۴ پیپلز پارٹی نے جیت لیں۔ حق حکومت عوامی لیگ کا تھا لیکن بھٹو صاحب نے کہا میں نے الیکشن میں حصہ اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھنے کے لیے نہیں لیا تھا۔ میں سری لنکا کی مسز بندرا نائیکے نہیں ہوں۔ اُدھر تم اِدھر ہم۔ قومی اسمبلی کا اجلاس معطل ہو گیا:

سَتَعلَمُ لیلیٰ اَیَّ دَینٍ تَدَاینت
وَاَیَّ غَرِیمٍ فی التقاضی غریمُها

....

اس اقدام کے خلاف مشرقی پاکستان میں احتجاج اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار، ان مظاہروں اور احتجاج کو بجائے قومی اسمبلی کے اجلاس کی کوئی تاریخ دے کر ختم کرنے کے، بغاوت پر محمول کیا گیا، اور "باغی" سزا کے مستحق۔ یحییٰ خان کے حکم پر کارروائی شروع کر دی گئی۔ اسی دار و گیر میں بہاریوں نے بھی بنگالیوں کے خون سے ہاتھ رنگنے شروع کر دیے۔ جنرل ٹکہ خان نے کہا، مجھے زمین چاہیے لوگ نہیں:

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لیں منہ آپ کی تلوار کا

....

بھٹو صاحب نے کہا شکر ہے پاکستان بچ گیا۔ جماعت اسلامی نے یحییٰ خان کو مجاہد اسلام کا خطاب دیا۔ مسلم لیگ نے محافظ پاکستان کا۔ دوبارہ الیکشن ہوا۔ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے امیدوار 'کامیاب' ہوئے عوامی لیگ پر پابندی لگ چکی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر کے یہاں پہنچا دیا گیا۔ ہم "مارشل ریس" کے بانوے ہزار افراد گرفتار ہو کر بھارت پہنچا دیے گئے۔ یحییٰ خان کو حکومت بھٹو صاحب کے حوالے کرنی پڑی اور بھٹو صاحب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ:

انھیں یوں کو رُخ کی ترے دید ہو گئی
اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہو گئی

....

تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ، انھیں کیا معلوم

تھا کہ یہ عید چھوٹی (میٹھی) نہیں بڑی ہوگی خون بہائے جانے والی عید الاضحیٰ:

سَتُبدِی لَکَ الایّام ما کُنتَ جاھلا
ویاءتیکَ بالاخبارِ مَن لَم تزوّدِ

(زمانہ تم پر وہ ظاہر کرنے کو ہے جس سے تم لاعلم تھے اور تمہارے پاس خبریں لانے والا وہ ہے جسے تم نے زادراہ نہیں دیا)

....

وہ جس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ خونیں ڈرامے کی تیسری کردار اندرا گاندھی بھی غیر طبعی موت مریں۔ مسز بندرا نائیکے نہ بننے والے کو بندرا نائیکے بننا پڑا۔ بانوے ہزار کے بدلے ایک کو چھوڑنا اور بنگلہ دیش کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ یہ خیال نہ آیا:

لَکُنتُ کمُھرِیقِ الذی فی سِقائِہِ
لِرَقراقِ الِ فوقَ رابیۃ صَلْدِ

(اس آدمی کا سا ہو جاؤں گا جو سخت ٹیلے پر متحرک چمکتا سراب دیکھ کر اپنے مشکیزے کا سارا پانی بہا دے)

پاکستان کے ابتدائی سالوں میں زرمبادلہ کا ذریعہ مشرقی پاکستان کی چائے تمباکو اور پٹ سن تھے۔ بھارت نے اثاثوں میں سے پاکستان کا حصہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس زرمبادلہ سے یہاں کارخانے لگے ہم خوشحال اور بنگالی بدحال ہوتے گئے مشرقی پاکستان

کمُرضِعَۃِ اَولادَ اُخریٰ وَضَیَّعَت
بنی بَطنِہا ھذا الضَّلالُ عنِ القَصدِ

(اس عورت کی طرح جو دوسری عورت کے بچوں کو دودھ پلائے اور اپنے بچوں کو ضائع کر دے یہ تو عدل سے بھٹکنا ہے)

....

اسی طرح ہماری کالونی تھا جس طرح ہندوستان انگریز کی کالونی۔ یہاں سے جانے والا بیوروکریٹ ڈھاکہ کے ایئر پورٹ پر اترتے وقت یہ کہنا نہ بھولتا Let me Synchronise my watch with the time of Colony مشرقی پاکستان کے لیے مثلاً ملائیشیا سے پام آئل کا جہاز بھی آتا تو چٹاگانگ کی بندرگاہ پر رکنے کے بجائے پہلے کراچی آتا اور یہاں سے کلیرنس لے کر دوبارہ تین ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے چٹاگانگ جاتا۔ آزادی سے پہلے انگریز مغربی اور گورے تھے۔ ہم سب مشرقی اور کالے تھے۔ ان کے بعد ہم مغربی اور ذرا کم کالے ہونے کی وجہ سے گورے اور مشرقی پاکستان کے لوگ مشرقی اور کالے ٹھہرے۔ اس مزعومہ امتیاز نے مغربی پاکستانیوں کو تفوق اور تکبر میں مبتلا کر دیا۔ اپنے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کے ازالے کی خاطر ایوب خان نے وہاں انڈسٹریز

لگانے کی خاطر کچھ رقم مختص کر دی لیکن وہ فنڈز بھی وہاں استعمال نہیں ہوئے۔
سابق چیف جسٹس محمد منیر From Jinnah to Zia میں لکھتے ہیں

The funds so reserved had to be utilized by industrialists of the west wing.

ایسا کیوں نہ ہوتا بیوروکریسی پر مہاجر، پنجابی اور پشتون قابض تھے۔ پاکستان کے آخری دنوں میں مرکز میں بھی صرف ایک بنگالی ڈپٹی سیکرٹری تھا۔ مشرقی پاکستان سے ہونے والی ناانصافیوں کے علم اور اعتراف کے باوصف سابق چیف جسٹس اور اس وقت ایوب کابینہ کے وزیر قانون محمد منیر (مرحوم) لکھتے ہیں:

I spoke to Ayub and suggested that there could be no fusion or common goal between the two provinces and asked him whether it would be better that instead of putting up with this nonsese to ask East Pakistan to take their own affairs In their own hands. Te suggested to me that I should talk about to some influential leader from East Pakistan. One day I was talking to Mr. Ramizuddin who had been a minister in Bengal or East Pakistan I broached the matter to him. His reply was prompt and straight. Te asked whether I was saugging secession. I Said yes or something like it as confederation or more autonomy. Te said look here we are the majority province and it is for the minority province to secede because we

are Pakistan.

اور حیران کن اور رمیزالدین کا جواب ''ہم پاکستان ہیں'' سن کر بھی وزیر قانون شرمندہ نہیں ہوئے ہوتے بھی کیسے کہ:

چشم را پردۂ خود کردہ بہ دیدن رفتہ
پنبہ درگوش نہادہ بہ شندن رفتہ

....

نہ صرف ناانصافیوں کو بلکہ ساتھ رہنے کو بھی Nonsnse کہا۔ شرمندہ نہ ہونے کا ''معقول'' جواز زبان، رسم و رواج، رہن سہن، موسیقی، لباس، خوراک (مچھلی چاول) سوائے اسلام کے کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ ہر چند اور ہرگاہ بھی اختلافات سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے باسیوں میں بلافاصلہ پڑوسی ہو کر بھی موجود تھے اور ہیں لیکن:

تا برد نام رفو پیرہن از یادش رفت

....

یہ قانونی نقطہ قاضی القضاۃ اور وزیر قانون کی تجویز پر اثر انداز نہ ہوسکا۔ ان کی تجویز پر عمل تو بہت پہلے ہی قائداعظم کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا۔ زبان جسے موصوف نے اپنی فہرست میں اولیت دی، کی بنیاد پر اردو بنگالی فسادات سے ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں شاہد احمد دہلوی کے منہ سے یہ بات کس عالم میں نکلی تھی: ''اردو نہیں تو پاکستان کیوں۔'' گویا ہاتھی جاتا ہے تو جائے دم نہیں جانے دیں گے:

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب
قصد کعبے کا نہ کیجیے گا بایں یُمن قدم

مبادا وہاں اردو عربی کا جھگڑا کھڑا ہو جائے۔ اردو بنگالی کا جھگڑا، اردو سندھی کا جھگڑا پھر مہاجر پشتون (اردو پشتو) کا جھگڑا۔

چشم بر راہ اند میخواراں کہ کے باراں شود
ابر می خواہند مستاں خانہ گو ویراں شود

....

میرے زمانہ طالبعلمی میں ابواللیث صدیقی ایبٹ آباد آئے اور یہ انکشاف کیا کہ اردو کی اصل جنم بھومی یہی خطہ ہے۔ مکہ جانا نہیں ہوا ہوتا تو مکہ کو اردو کی جنم بھومی بتاتے اور کیا عجب یہ دعویٰ بھی کر بیٹھتے کہ قرآن حقیقت اردو میں نازل ہوا تھا اموی دور میں کوفہ کے گورنر حجاج بن یوسف ثقفی نے اس کے عربی تراجم کروا کے مملکت کے سارے خطے میں پھیلا دیے۔ زبانیں اپنی جگہ خود پیدا کر لیتی ہیں۔ ان کے لیے انجمن ہائے ترقی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مصر کی زبان قبطی تھی۔ شام (سوریا) کی سریانی آج دونوں کی عربی۔ انگریزی کو آج دنیا میں جو مقام حاصل ہے کسی انجمن ترقی انگریزی کی وجہ سے نہیں یا اردو کو آج پاکستان میں جو مقام حاصل ہے اس ضرورت کا نتیجہ ہے جو

ناگزیر تھی اور ہے۔ پاکستان کے دولخت ہونے کی پہلی وجہ اردو بنگالی فسادات نہ ہوتے تو اردو رفتہ رفتہ بنگال میں بھی اپنی جگہ بنا لیتی - اردو پاکستان کے دولخت ہونے کا پہلا سبب تھی تاہم واحد سبب نہیں تھی۔ اصل سازش مغربی پاکستان کے کرتا دھرتاؤں کی تھی، مشرقی پاکستانی اس میں شریک نہیں تھے۔ وہ تو متحد رہنے کی خاطر ۵۶ء کے آئین میں اپنی عددی اکثریت سے بھی دستبردار ہو گئے تھے۔

بیا کہ ما و تو ہرجا برابر افتادیم
ہر آں قدر کہ وفا با تو نیست با ما ہست

....

جب علیحدگی کی تجویز پیش کی گئی تو جواب We are Pakistan تھا۔ جب دیکھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے تو مار مار کر الگ کر دیے گئے:

وَمَا سَاءَ نِی اِلَّا الَّذِینَ عَرَفْتُھُم
جَزَی اللّٰہُ خَیراً کُلَّ مَن لَّستُ اَعرِفُ

(میرے ساتھ برا سلوک انھوں نے کیا جنھیں میں جانتا ہوں اللہ بھلا کرے ان سب کا جنھیں میں نہیں جانتا)

چونکہ بجائے دامن اور بند قبا کو دیکھنے کے پاکی داماں کی حکایت بڑھانی مقصود تھی۔ ذمہ دار مجیب، بھارت اور سوویت یونین کو ٹھہرا کر مگرمچھ کے آنسو بہائے گئے۔ عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔

مشرقی پاکستانیوں کی شکایت بالکل درست اور بجا تھیں اپنے بچوں کو چھوڑ کر دوسری عورت کے بچوں کو دودھ پلانے والی نے اپنے بچوں کو دودھ پلانا شروع کیا تو اس کے بچے تندرست و توانا اور دوسری عورت کے بچے کمزور اور ناتواں ہوتے گئے۔ آج بنگلہ دیش کا ٹکہ ہمارے اڑھائی روپے کے برابر ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ پاکستان کی تاریخ محلاتی سازشوں کی تاریخ چلی آ رہی ہے۔ اس سنت جاریہ پر عمل اب بھی ہو رہا ہے یعنی:

ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

....

خدانخواستہ، خدانخواستہ بچ گئے ہوئے پاکستان کو کچھ ہو گیا تو کس کو قربانی کا بکرا بنا کر اور کس بیرونی طاقت کو ذمہ دار ٹھہرا کر مگرمچھ کے آنسو بہائے جائیں گے۔ ناانصافیاں تو اب بھی ہو رہی ہیں چاہے ایک صوبے کی دوسرے صوبوں کے ساتھ ہوں یا ایک صوبے کی اپنے کسی انگ کے ساتھ یا ایک طبقے کی دیگر طبقات کے ساتھ جب کہ سپر پاورز میں ہے:

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اور یہاں خود پاکستان میں:

در ہر دہن نجگ نجاتے دگر است

☆☆☆☆☆

شہزاد قیصر _ ایک تاثر

شہزاد قیصر کے بارے میں سُنا تھا کہ وہ فلسفے کا طالب علم ہے۔ بہت ملنسار ہے اور محفل میں بڑی خوبصورت گفتگو کرتا ہے۔ غالباً 1983 کا اوائل تھا کہ اُس کا لاہور سے تبادلہ ہو گیا اور وہ ملتان میں ایک اہم انتظامی عہدے پر فائز ہوا۔ پہلی ملاقات رسمی اور سرسری تھی لیکن اُس کا طرزِ تکلم نہایت اثر آمیز تھا۔ یوں لگا کہ برسوں کی شناسائی ہے ۔ مُلاقاتیں بڑھیں اور اُس کی ذات کے جوہر آشکار ہونے لگے۔

شہزاد قیصر کا تشخص کئی خصوصیات کا مُرکب ہے۔ وہ بلا کا ذہین ہے۔ وہ بہت مخلص ہے۔ وہ بہت فراخدل ہے۔ اُس کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ اِنکسار کا پُتلا ہے۔ اپنی عمر سے بڑھ کر میچور ہے اور مستزاد یہ کہ اپنے بارے میں خوب آگاہ ہے۔

شہزاد قیصر سے اُس کے دفتر میں روزانہ ملاقاتیں ہوتیں۔ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ حسِ مزاح کا فرد کی خود آگہی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ شہزاد قیصر مزاح کا شیدائی ہے۔ لیکن وہ ظرافت کو مُبتذل نہیں ہونے دیتا۔ ہنستے اور ہنساتے اُس نے ایک معاصر انگریزی اخبار میں فلسفے اور مابعد الطبیعات پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے اور پھر 1984 کے اوائل میں اُس کے انگریزی مضامین پر مشتمل کتاب Quest for the Eternal شائع ہوئی۔ اہلِ علم حیران ہو گئے کہ ایک مصروف اور جان لیوا اِنتظامی عہدہ پر مُتمکن شخص اِتنی دقیق علمی کاوش کا "مرتکب" کیسے ہوا!

شہزاد قیصر کو اپنی حیرت دوسروں کی طرف منتقل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ وہ ایک عام سے قد کاٹھ کا آدمی ہے۔ جسے میانہ قد بھی مشکل سے کہا جا سکتا ہے لیکن اُس کا ذہنی قامت بہت بلند ہے۔ دُور بینی کا یہ عالم ہے کہ ابتدا سے پہلے اِنتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ سگریٹ سے ایک تخلیقی Catalysis کا کام لیتا ہے۔ لکھنے پر آجائے تو ایک سگریٹ فی صفحہ پیتا چلا جاتا ہے یا ایک صفحہ فی سگریٹ لکھتا چلا جاتا ہے۔

شہزاد قیصر نے جلد ہی "دُوجی اکھ" مکمل کر لی۔ گویا وہ فلسفے سے ادب کے میدان میں داخل ہو گیا۔ فلسفی زندگی کا شارح ہی تو ہوتا ہے۔

شہزاد قیصر نے جلدی ہی انشائیہ نگاری بھی شروع کر دی۔ انشائیہ نگاری کے ناقدین نے فوراً رائے صادر کی کہ اُس کے انشائیے صنفِ انشائیہ کے مروج پیمانوں پر پورے

سید افسر ساجد

نہیں اُترتے۔ ان میں مزاح کا عنصر زیادہ ہے۔ کچھ بہت طویل ہیں اور کچھ اتنے مختصر کہ انشائیہ کے بجائے مضمون یا تمثیل نظر آتے ہیں۔ لیکن شہزاد قیصر نے انشائیہ کی تین کتابیں لکھ ڈالیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا! لودھراں میں انشائیہ کانفرنس کروائی تو انشائیہ کے دونوں فریق یکجا کر دیئے۔ برجستگی، شوخی، معنی آفرینی شہزاد قیصر کے انشائیے کے Coordinates ہیں۔

ملتان میں تیسری بلکہ چوتھی بار اُسکی آمد حاکم ضلع کے طور پر تھی۔ چہرے مُہرے سے وہ حاکم نظر ہی نہیں آتا تھا۔ نہ ہی اُسے حاکم بننے کا شوق تھا۔ بہت جلد اُس نے اپنے حسنِ سلوک، مہر و مروت اور انتظامی صلاحیتوں سے ہر خاص و عام کو متاثر کر لیا۔ وہ حقیقت پسند ہے۔ لہٰذا اُس نے اپنے فرائض منصبی کو کسی طور دنیاوی جاہ و جلال کا نقیب نہیں بننے دیا۔ وہ اپنے آپ ہی میں رہا۔ فی زمانہ یہ بہت بڑا جہاد ہے۔ شہزاد قیصر بڑا آزاد منش ہے۔ اُس کی نظر میں اقتدار ہیچ ہے۔ لیکن وہ فرشتہ بھی نہیں۔ گوشت پوست کا ادنیٰ سا انسان ہے۔

شہزاد قیصر ہر وقت عجلت میں نظر آتا ہے۔ بہت کم اُسے Relaxed دیکھا جاتا ہے۔ بظاہر اُسے کوئی دُکھ بھی نہیں۔ ہاں اگر اُسے ہے تو ہستی کا غم ہے

نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!!

.....

وہ ہونے نہ ہونے کے درمیانی بُعد کو اپنی ''دوجی اکھ'' سے ماپنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شہزاد قیصر بسا اوقات فوراً جھنجھلا اُٹھتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ادیب بنیادی طور پر Idealist بھی ہوتا ہے۔ وہ چیزوں کو ایک خاص زاویے سے دیکھتا ہے۔ جب حقیقت اُس کے آئیڈیل سے متصادم ہوتی ہے، وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اس تصادم کو ایک کمتر لیول پر جھنجھلاہٹ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ شہزاد قیصر داخل اور خارج کے بین بین اپنی راہ کا تعین کرتا ہے۔ وہ یاس پسند نہیں لیکن یاس کو زندگی کے امکانات سے خارج بھی نہیں کرتا۔

شہزاد قیصر کو بنیادی طور پر خوش اُمید (Optimist) ہے۔ وہ کالے بادلوں میں بھی روشنی کی کرن کا متلاشی رہتا ہے۔ کسی زمانے میں وہ گھنی مونچھیں رکھتا تھا۔ کہانی کے بادشاہ کی طرح وہ آئینے میں سفید بال دیکھ کر مونچھوں سے دست بردار ہو گیا۔ پھر بھی چہرے کی معصومیت میں کمی نہیں آئی۔

شہزاد قصر ایک دفعہ سڑک کے حادثے میں موت سے بال بال بچا۔ ہسپتال میں رہا۔ اہلیہ اور بچے سمیت۔ اس تجربے نے اُس میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔ لیکن کار وہ اب بھی اُسی تیزی سے چلاتا ہے۔ اب وہ حاکمِ ضلع نہیں۔ محکمہ تعلیم میں بھی اُس کی انتظامی کارکردگی مثالی ہے۔ ''میں ناہیں سب توُں'' مشقِ سخن کی بالیدگی ہی کا نتیجہ ہے۔

حق دی راہ وچ رہیا کھلوتا!
دُوجی نہ کوئی منزل چاہی

.....

Otherwise no amount conflict. The materialist dialectic has falsified the human situation. On the contrary, metaphysical dialectic shall embrace the trio of God, man and universe. The ideal archetype of unity in all spheres shall be realized.

Quest For The Eternal

("Parameters of Humanism")

"The accent on the person or the individual has become an integral component of humanism. Kierkegaard posits the category of "the individual". Nietzsche introduces the concept is "the man of flesh and bone. Marcel, Jaspers, Buber and a galaxy of

کافیوں کے ایک اور مجموعے "گل وچ پائیم پریت مہار" کا مینو سکرپٹ تیار ہے۔ مذہب اور مابعدُ الطبیعات پر انگریزی میں پانچ کتابیں لکھ چکنے کے بعد بھی اُس کا قلم جامد نہیں ہُوا۔ اور اب وہ خواجہ فریدؒ کی Metaphysis پر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ڈاکٹریٹ کر رہا ہے۔ اس کا اسلُوب نہایت سنجیدہ اور رویہ محققانہ ہے۔ تصوف، مذہب اور مابعد الطبعیات پر مشتمل تحریروں میں وہ اپنی بات بڑے منطقی انداز میں کرتا ہے۔ لیکن بین السطور اُس کا Posture علم و انکسار پر مبنی ہوتا ہے۔ ان سطور سے اُس کے شعور و دانش کا حدود اربعہ بآسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

Quest For The Eternal

("Psychothera py and Western Tradition")

"In answer to Frantz Fenon, Herbert Marcuse, Norman O. Brown, R.D. Laing and many other radical insight with a radical political commitment is only possible when psychology is based on metaphysics.

قاری کی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ انسان کی بوالعجبیوں کا وہ بڑی ہمدردی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ لفظوں کا اکانومسٹ ہے۔

"شوہر، بیگم اور سسرال ندی کے تین کنارے ہیں۔ اِن میں باہمی ربط صرف اِس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ شوہر اپنی بیگم سمیت ندی میں کود جائے۔" کلیرنس سیل ("شوہر بیگم اور سسرال")

اُس کے ہاں برجستگی، ذات اور تخلیق کے درمیان دوئی رویہ متحرک رہتی ہے۔ مزاح کے میدان میں کہیں کہیں تو وہ پطرس بخاری کی سی سبک روی اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

"درسگاہوں میں پابندیٔ وقت کا جو راگ الاپا گیا ہے اُس نے ہماری نسلوں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ صبح کے وقت تمام شہر ایک مخبوط الحواس انسان کی مانند لگتا ہے۔ طلبا اور طالبات کو درگاہوں میں وقت پر پہنچانے کی ایک دوڑ لگی ہوتی ہے۔ جن میں خود طلبا اور طالبات، اُن کے والدین، بھائی بہن، رشتہ دار، عزیز و اقارب، ملازمین، گھر داماد، گھوڑے ٹانگے وغیرہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس دوڑ کی وجہ سے سڑکوں پر اتنی گہما گہمی ہوتی ہے کہ اساتذہ کرام اُس وقت گھر سے ہی نہیں نکلتے۔ پرواز کے لیے مطلع صاف ہونا چاہیے لیکن اب حالات اتنے ناسازگار نہیں ہیں۔ اس سیکٹر میں بھی اُمید کی بہت سی کرنیں نظر آتی ہیں۔ ماسوائے

thinkers stress the primacy of the individual. Dostoyevsky, Rilke, Sartre and camus portray the individual caught in the vertigo of the modern human situation. Heidegger is primarily concerned with the problem of Being. But he describes the structure of dasein for it is man who raises the fundamental question of Being. The existential thinkers differ in tracing the relation between the individual and the community. However, their commitment to the individual lands them in the orbit of humanism."

شہزاد قیصر کی ہمہ جہتی (Versatility) کا اظہار اُس کے انشائیوں میں بقدر احسن ہوتا ہے۔ وہ مزاح سے زندگی کی ناہمواریوں کو

چند پسماندہ درس گاہوں کے جہاں ابھی بھی پابندیٔ وقت کا درس دیا جاتا ہے باقی تمام تعلیمی ادارے آزادی کی ایک فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکچر کے ختم ہونے سے چند منٹ قبل طلبا کے غول کلاس میں داخل ہوتے ہیں اور استاد کی نظریں اُنھیں جھک کر سلام کرتی ہیں۔ اُستاد کی شفقت سے اُن کی حاضری پہلے ہی لگ چکی ہوتی ہے۔ کاش ہماری پرانی نسلوں کو بھی یہ ایام نصیب ہوتے۔''

(کلیرنس سیل۔ ''وقت ناوقت'')

مزاح سے سنجیدگی اور معنویت کی تخلیق شہزاد قیصر کا خاصہ ہے۔ ''لنڈا بازار سے گزرتے ہوئے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی رقاصہ کا بدن تھرتھرایا ہو۔ یہاں سَودوں پر تکرار اور سِکوں کی جھنکار سے طبیعت میں عجب قسم کی کراہت پیدا ہوتی ہے۔ آدمی بھاگ کر کہاں جائے۔ یہ بازار تو ایک سُرنگ کے ذریعے تمام بڑے بازاروں سے منسلک ہے۔ بیرونی ممالک کی کئی چیزیں چاہے جعلی ہوں، مگر وہ اپنا اصلی رنگ دکھا کر چھوڑتی ہیں۔ ان کے ناطے ایک پڑھا لکھا شخص بھی جاپانی ہائیکو کی مانند تین مصرعوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ مغربی اقدار کا لُنڈا بازار ہے۔ مغربی اقوام کی اُتاری ہوئی قدریں مغربی لباس کی مانند اب ہماری زندگی کی زینت ہیں۔ یہ اقدار ہماری معاشرتی پہچان بھی ہیں۔'' (آئینہ بنے ہے پیراہن۔ لنڈا بازار)

شہزاد قیصر ایک فرا خدل اِنسان ہے۔ وہ اپنے رُفقائے کار کو کبھی کمتر نہیں سمجھتا۔ وہ اِنسان کی عزت اور عظمت کا قابل ہے۔ کام کی ''فراوانی'' کی بنا پر اُسے اپنی یادداشت ''محفوظ'' کرنی پڑتی ہے۔ بایں ہمہ اُسے کوئی کام بار بار یاد دلاتے ہوئے ناخوش گواری کا احساس کبھی نہیں ہوتا۔ یہی اُس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ وہ کئی کام اکٹھے کرنے کا عادی ہے۔ فون کے ساتھ قلم بھی چل رہا ہے اور قلم کے ساتھ احباب اور ملاقاتیوں سے گفتگو بھی۔ کبھی کبھی اس عمل کے دوران تحریر میں آنے والی بات فون کی نذر ہو جاتی ہے اور فون سے متعلق کلام ملاقاتی کے گوش گزار۔ اور احباب سے گفتگو موضوعِ تحریر بن جاتا ہے۔ اُس کے انشائیے فرد کی انہی کیفیات کا برملا اظہار ہیں۔ چونکہ شہزاد قیصر میں منافقت نہیں۔ لہٰذا وہ صرف دوستوں ہی کا دوست ہے۔

صنفِ نازک کے بارے میں اُس کی معلومات اور دلچسپیاں اپنی شریکِ حیات تک ہی محدود ہیں۔ تاہم اُس مجلسی زندگی کا گراف گھر، دفتر اور خاندان سے ماورا ہے۔ میرے خیال میں یہی اُس کی شخصیت کی ہمہ جہتی کا راز ہے۔ دراصل اُس کی ذات کی رونق اُس کے متنوع معمولات کے ہنگامے پر موقوف ہے۔ وجودی سطح پر اس نقطے پر اُس کی جبلت اُس کی لامتناہی صلاحیتوں کے انکشاف و اظہار کا ایک ہمہ گیر وسیلہ بن جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

اختر حسین جعفری کی شاعری ادراک کی تنقید

عہد حاضر میں جدید اردو نظم اپنے ظاہری و باطنی ارتقاء کی جس سطح پہ نظر آتی ہے اس کے لیے اس صنف کو اختر حسین جعفری کا ممنون ہونا چاہیے۔ اگرچہ خیال اور دھرپد گائیکی کی طرح اختر حسین جعفری کی نظم نے بھی صرف خواص کو ہی دعوت لطف و فکر دی لیکن ان کے شعری طنطنے کی گونج نے دور دور تک سفر کیا۔ اختر حسین جعفری کے تخلیقی تناظر کے باعث ان کے شعری اظہار میں پیدا ہونے والے عناصر اور ان کی ترتیب نے جس ایمائیت کو متشکل کیا وہ اتنا منفرد اور ادراک طلب تھا کہ ناقدین اس کی تفہیم کے سامنے بے بس نظر آئے۔ ان کی شاعری پر بات ابھی تک ان کی جزوی تفہیم سے آگے نہیں بڑھ سکی جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر بڑا تخلیق کار اسی لیے بڑا ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے موجود تخلیقی دائروں سے نکل کر کچھ نیا تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مروجہ تنقیدی و تجزیاتی پیمانے اپنے سکہ رائج الوقت طرز تفہیم و تعبیر کے باعث اس کے ادراک کے قابل نہیں ہو پاتے لیکن اختر حسین جعفری اس میں کامیاب ٹھہرے۔ لہٰذا ناقدین اس تخلیق کار پر نقد و نظر کا تقاضا پورا کرنے کے لیے نہ تو کوئی نیا تنقیدی پیمانہ وضع کر پاتے ہیں نہ رائج پیمانوں کو توڑ کر یا ان سے بلند ہو کر تخلیق کار کی سطح تک پہنچنے کی ہمت کرتے ہیں۔ نتیجتاً اسے مشکل قرار دے کر گریز اختیار کرنے کا رویہ جڑ پکڑ جاتا ہے۔ حالانکہ میرے خیال کے مطابق اختر حسین جعفری اتنے بھی مشکل شاعر نہیں کہ ان کے لسانی و استعاراتی شکوہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جائیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ میرے ہمعصر ناقدین شعر نے ان تک پہنچنے کے لیے نہ مناسب تعلیم حاصل کی ہے نہ تربیت اور ذاتی فنی کمزوری کے باعث اپنی علمی و ادبی سطح بلند کرنے کے بجائے شاعر کو کبھی مشکل اور کبھی مبہم

فرحت عباس شاہ

کہہ کر مجید امجد، ن م راشد اور فیض احمد فیض کے آستانوں پر دراز ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔

ادرا کی تنقیدی طریقہ ہمیں سب سے پہلے شاعر کے تخلیقی نظام کو سمجھنے کی کوشش کی ترغیب دیتا ہے اور ہم اختر حسین جعفری کا مزاج، علم، عقیدہ، نظریہ اور محسوساتی چال چلن سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک صاحب مطالعہ انسان تھے۔ علمی و ادبی گہرائیوں کی خاک چھانتے رہنا ان کے طرز حیات میں شامل تھا۔ تاریخ خصوصاً مذاہب، انبیاء علیہ السلام کے ادوار، سیاسی اور تہذیبی حالات کا مطالعہ ان کا شغف تھا، عربی، فارسی، فرانسیسی، روسی اور انگریزی ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ تاریخ اسلام میں واقع کربلا اور انبیاء کرام اور ان کے راست عمل پیروکاران کی مظلومیت، حکمران طبقے کا جبر اور انسانی شکستگی سے جنم لینے والی آفاقی افسردگی ان کے شعری نظریے کی اساس بھی ہے اور ان کے تخلیقی نظام کی بنیادی اکائی بھی۔ یہ افسردگی اپنی شدت میں تو کبھی ہیئت کی تبدیلی سے ملال اور غم میں ڈھلتی دکھائی دیتی ہے تو کہیں یکساں اداسی میں بدل جاتی ہے یہاں تک کہ یہ تمام کیفیات شاعر کے باطن سے نکل کر خارج کے مختلف استعاراتی مظاہر کے روپ میں موجود بھی نظر آتی ہیں۔ اختر حسین جعفری کا احساس، کیفیت، جذبہ، خیال، فکر، نظریہ، زبان اور کرافٹ نہایت بلند مضبوط اور معتبر ہے۔ وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ بڑی شاعری اپنے ابلاغ کے لیے ادنیٰ نہیں اعلیٰ الفاظ کے انتخاب کا تقاضا کرتی ہے۔ اعلیٰ لسانی اسلوب ان کا اپنا انتخاب ہے اور ارفع استعاراتی نظام انہیں عطا ہوا ہے۔ آسان ابلاغ پر اعلیٰ کرافٹ اور پرشکوہ الفاظ کی ترجیح کا فیصلہ ان کا شعوری فیصلہ ہے۔ لگتا ہے احساسات و کیفیات کی سادہ ترسیل اور فکر کا آسان ابلاغ ان کے معیار کا تقاضا کبھی رہا ہی نہیں۔ ان کے شعری نظریے کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اختر حسین جعفری انسانی تاریخ میں برپا ہونے والی ہر کربلا کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں طبقاتی تفریق کے حوالے سے غریب اور امیر سے زیادہ ظالم اور مظلوم کی تقسیم پوری قطعیت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان کی ترقی پسندی ہر طرح کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ہے اور وہ بلا امتیاز رنگ، نسل، جغرافیہ یا مذہب ہر مظلوم کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔

بڑا اکتساب الہام کے اظہار میں ڈھلنے کو وسیع و عمیق بیان فراہم کرتا ہے۔ الہامی ادراک کے دریا کو اگر اس کے مطابق کھلے پاٹ اور کشادہ راستہ میسر نہ آئے تو بہاو میں بھی رکاوٹ آتی ہے اور پانی کناروں سے باہر بھی چھلکتا ہے۔ اختر حسین جعفری کی شعری لغت اور تمثیلی قاعدہ اسی لیے اتنا مضبوط ہے کہ ان کا معروضی اکتساب بہت وسیع و عریض تھا۔ زمانوں پر محیط جبر کے شعور سے پیدا ہونے والی افسردگی کو زبان و بیان کی جس تشکیل کی ضرورت تھی وہ ہمیں ''آئینہ خانہ'' اور ''جہاں دریا اترتا'' میں موجود تخلیقی اظہار کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اختر حسین جعفری کے نظام تخلیق

کی بنیادوں میں کارفرما دوسری اکائی وہ ردعمل ہے جو اردگرد برپا کیا جانے والا طبقاتی امتیاز ہے۔ اور تیسری اکائی واقعہ کربلا اور انبیاء کرام کے انقلابات کی روح ہے۔ اختر حسین جعفری کا تمثیلی اور استعاراتی نظام انہیں تین اکائیوں اور فطرت کے مظاہر سے داخلی و خارجی ہر دو سطح پر امتزاج کے باعث وضع ہوتا ہے۔ ان کے محسوس، وقوف اور ادراک کے عمل کے پیچھے صدیوں پرانی انسانی شکست و ریخت کی ایسی تہذیب کے نقوش، لسانی تصویریں کے ذریعے نطق حاصل کرتے دکھائی دیتے ہیں جو حکمرانوں، سرمایہ داروں اور طاقتور طبقے کی طرف سے وضع کی گئی تہذیب کے مدمقابل یا برعکس استوار ہوتی اور مظلومیت کے لہو سے نمو پاتی ہے۔ اگر میں مختصراً کہوں تو یوں کہوں گا کہ اختر حسین جعفری کا شعری نظام اس متوازی تہذیب کی اساس پر تعمیر ہوا ہے جسے مظلوم طبقے کے آلام اور جدوجہد مرتب اور وضع کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے تخلیقی ادراک کی تشکیل کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو تمثیلاتی اور استعاراتی سطح پر ایک ایسے احساس کی کامیاب ترسیل کا باعث بنے جو عام بول چال یا مروج لکھنے پڑھنے کی زبان میں ممکن نہیں تھا۔ یہ اس لیے بھی مشکل تھا کہ بات صرف نظریے یا نقطہء نظر کے ابلاغ کی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ احساساتی اور کیفیاتی اظہار کی زیادہ تھی ورنہ اسے نثر کے پیرائے میں بھی لکھا جا سکتا تھا۔ شعری اظہار کا سب سے پہلا تقاضہ ہی یہ ہے کہ اسے کیفیاتی سیاق و سباق میں بیان کیا جائے تاکہ وہ صرف پڑھنے والے کے نقطہء نظر کو ہی متاثر نہ کرے بلکہ اس کے احساس کو تہذیب بخش کر اسے اعلیٰ انسانی اقدار سے منسلک ہونے کا موقع فراہم کرے۔

اختر حسین جعفری کی شاعری کا سب سے اہم وصف مکالمہ ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کا تخاطب صرف عہدِ موجود یا آنے والا وقت ہی نہیں بلکہ گزرا ہوا زمانہ بھی ہے۔ ان کی نظموں میں یہ آفاقی مکالمہ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری میں مکالمہ بھی ایک ایسی اساس کی حیثیت رکھتا ہے جو ان کے پورے تخلیقی نظام کو بخوبی سمجھنے، کھولنے اور پرکھنے کا راستہ فراہم کرتی ہے۔ جہاں تک ان سے میری ذاتی ملاقات، ان کے ساتھ مجالس میں بیٹھنے اور انہیں سننے کے مواقع کا نچوڑ ہے وہ بھی یہی ہے کہ وہ مکالمے کے آدمی تھے۔ دنیا کے ہر طرح کے موضوع پر علمی گفتگو کرنا اور سننا پسند کرتے تھے۔ یہ رویہ آپ کو ہمیشہ ہر سچے عالم کے ہاں نظر آئے گا سو ان کے ہاں بھی غالب ادبی رویئے کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس بات کی گواہی ان کے قریبی احباب اور خاندان کے افراد بھی دیتے ہیں۔ 1988 میں خود اختر حسین جعفری کی ادارت میں شائع ہونے والے مجلے "فردا" میں شامل ان کا ایک مضمون، "ادب میں عصر کی اہمیت" اس ضمن میں دلیل کے طور پر پیش کیا جانا بے جا نہ ہوگا

جس کو انھوں نے مکالمہ نمبر 1 کا ذیلی عنوان دیا دیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ شاعر کے مکالمے کو کسی ڈرامے یا فلم کے لیے لکھے گئے مکالمے کی تکنیک کے طور پر نہ دیکھا جائے بلکہ ایسے مکالمے کے طور پر دیکھا جائے جو خارجی سطح پر تو خود کلامی کے زمرے میں آتا ہو لیکن شاعر کے تخلیقی بطون میں سوال و جواب کی شکل میں ہی ہوا ہو۔ اب یہ شاعر کی اپنی مرضی ہے کہ وہ قاری کے سامنے اسے سوال و جواب کی شکل میں لاتا ہے، جواب کی یا محض سوال کی شکل میں۔ ذیل میں درج اختر حسین جعفری کے دوسرے شعری مجموعے (جہاں دریا اترتا ہے) کی نظم، ''اک حرف فسردہ داغ میں ہے'' کا ایک بند دیکھئے ----

''میں کون جو انجم سحر سے
اثبات و ثبوت ذات چاہوں
دریا سے حساب آب مانگوں
صحرا سے تعینات چاہوں
مہتاب سے چاندنی کا معیار
مضراب سے زخم نغمہ تار
میں کون شمار کرنے والا
میں اپنی صدا سے ڈرنے والا
بارش سے سفال بھرنے والا
میں کون سوال کرنے والا''

.....

یہ وہ صدیوں پرانا سوال ہے جو انسان کبھی خدا یا نظام فطرت اور کبھی خود سے پوچھتا ہے۔ پورا وجودی فلسفہ اثباتِ ذات کی اس آرزو کی تشریح اور اس سوال کے جواب پر کھڑا نظر آتا ہے۔ شناخت کو درپیش وہم و گمان اور ہونے نہ ہونے کے اسباب کی جستجو آج بھی صرف اس سوال کا تشفی بخش جواب حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن اختر حسین جعفری کی یہ نظم بادی النظر میں اثبات ذات کا تسلی بخش جواب مانگتی ہے لیکن اگر اس پوری نظم کو کھولا جائے تو منکشف ہوتا ہے کہ حقیقتاً میں یہ نظم سوال ہی اس لیے اٹھاتی ہے کہ شاعر کو اس کا جواب دینا مقصود ہے۔ پوری نظم دیکھئے۔۔۔

اک حرف فسردہ داغ میں ہے

اک حرف فسردہ داغ میں ہے
اک بات بجھے چراغ میں ہے
اک نام لہو کی گردشوں میں
طوفان میں ڈولتا سفینہ
ڈوبے نہ بھنور کے پار اترے
اک شام کہ جس کے بام و در کو
ہاری ہوئی صبح سے شکایت
روٹھے ہوئے چاند کی تمنا
اک راہ نورد جو یہ چاہے
پاؤں نہ حدِ وفا سے نکلے
سر سے نہ سفر کا بار اترے

(۲)

پتا تھا ابھی ہر اسفر کا
کیچی تھی ابھی صدا کی ٹہنی
کیوں ریشہ، برگ، گم نمو میں

پھر آتش رنگ جل اٹھی ہے
کیوں صبح کی بے عمل سپہ نے
ہتھیار سجا لیے بدن پر
مقتل میں صفیں درست کی ہیں
کیوں درد کے جھٹپٹے کی حد پر
پھر ہجر غروب ہو رہا ہے
پھر نظم طلوع ہو رہی ہے

(3)

میں کون جو انجم سحر سے
اثبات و ثبوتِ ذات چاہوں
دریا سے حسابِ آب مانگوں
صحرا سے تعینات چاہوں
مہتاب سے چاندنی کا معیار
مضراب سے زخم نغمہ تار
میں کون شمار کرنے والا
میں اپنی صدا سے ڈرنے والا
بارش سے سفال بھرنے والا
میں کون سوال کرنے والا

(4)

کاغذ پہ سلگتی شام لہام
تختی پہ سپیدۂ سحر ہے
اے سطرِ نمودِ ذات، تیرا
کس ساعت معتبر میں گھر ہے
اس بام پہ میرے نام کی خشت
دیوار پر دھرا یاغ میرا
مہتاب کو میرے روبرو کر
آئینہ ہو مجھ پہ داغ میرا
مجھ پر بھی کھلیں حدود میری
مجھ کو بھی ملے سراغ میرا
میں کون؟ کہاں مرا سفر ہے
اے سطرِ نمودِ ذات میرا
کس ساعتِ بے اماں میں گھر ہے

(5)

اک تیر مفاہمت سے رشتہ
صیاد میں، صید میں، ہدف میں
اک سیل موج سے ہیں پیدا
رابطے ساحل و صدف میں
میں اپنا حریف ڈھونڈتا ہوں
اک لشکرِ درد صف بہ صف میں
اترے یہ سنان حرفِ وعدہ
خود میرے کنار میں، طرف میں
شاید کہ ثبوتِ ذات پاؤں
میں اپنی عبارتِ حلف میں

.....

نظم میں احساس بے مائیگی کا مائیگی سے نبرد آزما ہونا ہی دراصل انسان کے ہونے، اس کی آزادی اور خود مختار ہونے کی دلیل اور ثبوت ہے۔ خود میرا اپنا نظریہ بھی یہی ہے کہ انسان کا ہونا اور اس کی بقا اسے معدوم کرنے والی قوتوں سے نبرد آزما ہو کر فتح پانے میں مضمر ہے۔ شیکسپیئر کے ہیملٹ کا ٹو بی اور ناٹ ٹو بھی کا معمہ اختر حسین جعفری کے ہاں اتنی سہولت سے حل ہوتا نظر آتا جو تمام وجودی فلسفیوں کے لیے ایک واضح سمت کا تعین کرتا ہے۔ دنیا بھر کے المیہ ادب کے پیچھے بقا کی یہی جنگ کارفرما ہے جسے خالص جینے اور

ہونے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اختر حسین جعفری کی درج بالا نظم اسی کیفیت خیال اور فکر کو تقویت دے کر وہ تائید فراہم کرتی ہے جو بذات خود انسان کے خیال کی آزادی اور اسے بے مایہ یا بے نام و نمود قرار دینے والے مظاہر کو شکست دیتی نظر آتی ہے۔

اس درجِ بالا بحث سے ترقی پسندی کی وہ اعلیٰ ترین شکل بھی سامنے آتی ہے جسے صرف سیاسی جدوجہد اور انقلاب کی خواہش تک محدود کرنے اور وقتی انقلابی نعروں کے پیچھے چھپایا جاتا ہے۔ فرد کو مجبورِ محض بنا کر رکھنے کے خواہشمند طبقات سیاسی جبر سے پہلے فکری اور نفسیاتی جبر مسلط کرتے چلے آئے ہیں۔ اختر حسین جعفری کی حریتِ فکر اسی گرد ہی تسلط سے آزادی کا علَم ہے جو انسانی تاریخ کے ہر اس جبر اور تسلط کے سینے میں گڑا نظر آتا ہے جس کے ذریعے انسان کو انسان سے مظلوم انسان میں تبدیل کیا گیا۔

اختر حسین جعفری کی نظم ایک ایسے عہد میں اردو زبان و ادب اور مشرقی تخلیقی تہذیب کو اعتبار بخشتی نظر آتی ہے جب اقبال کے بعد ن م راشد اور مجید امجد تک شعرا مغربیت اور فارسیت سے شدید متاثر نظر آتے ہیں۔ ن م راشد اور مجید امجد کا دور وہی دور ہے جب جدید اردو نظم اپنے خدوخال ترتیب دے رہی تھی دوسری طرف نئی شاعری کی تحریک نئی لفظیات اور نئی تمثیلات کا تقاضا کرتی دکھائی دیتی ہے اور ڈاکٹر انیس ناگی اور ان کے رفقائے کار کلاسیکی غزل کو یکسر مسترد کر کے نئی نظم اور نئی تشکیلات کا تصور پیش کر چکے تھے۔ لیکن ہر بڑے شاعر کی طرح اختر حسین جعفری کسی قسم کے دباو میں آئے بغیر ایک ایسا جہان شعر تعمیر کر رہے تھے جو کسی بھی خارجی رجحان کا اثر قبول کرنے کی بجائے اپنی ذاتی انفرادی اور فطری تخلیقی آبادکاری پر پر اعتماد تھا۔

میرے نزدیک بڑی شاعری زبان و بیان کے اول بدل سے وجود میں نہیں آتی بلکہ بڑے شعر سے وجود میں آتی ہے۔ جعفری صاحب کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا۔ ان کی کیفیاتی شدت، خیال کی بوقلمونی اور فکر کی بلندی انہیں بتا چکی تھی کہ وہ اپنی ہی کلاسیکی زبان میں تمثیلات کا ایسا منظر سجانے کی قدرت رکھتے ہیں جو خود زبان خصوصاً شعری زبان کو مزید معتبر بنا دے گی۔ اختر حسین جعفری کے ہاں استعاروں اور علامتوں نے بڑی وضاحت سے الفاظ اور تراکیب کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ اختر حسین جعفری کی علامت متحرک اور استعارے صورتحال میں اتر کر زندہ کرداروں کی طرح نہ صرف منظرنامے کا حصہ بنتے نظر آتے ہیں بلکہ قاری کی انگلی پکڑ کر مجرد کیفیات تک لے کر چلنے کا فریضہ بھی سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں درج ذیل نظم دیکھئے -----

"ایذرا پاؤنڈ کی موت پر"

"تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا

جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
انتظار بہار بھی کرتے!
دامن چاک سے اگر اپنے
کوئی پیمان پھول کا ہوتا!
آ تجھے تیرے سبز لفظوں میں
دفن کر دیں کہ تیرے فن جیسی،
دہر میں کوئی تو بہار نہیں"

.....

اسی حوالے سے ایک اور نظم دیکھئے:

"عورتیں، رات، زرد روشنیاں"

"دشت در دشت، کھیت کھیت ہوا
شبنمیں پاؤں پر چلے گی بہت
ڈھیر گندم کے اشک کے خرمن
شاخ اپریل کی پھلے گی بہت
بند کمرے، گرج چمک، برسات
ابر برسیں گے اور ڈرائیں گے
خوف سے شیلف میں کتابوں کے
خشک الفاظ بھیگ جائیں گے
عورتیں، رات، زرد روشنیاں
دن کی محرومیوں پہ روئیں گی
برف شب بھر گرے گی جسموں پر
صبح ہوگی تو بال دھوئیں گی"

.....

ہماری اردو شاعری میں کنکریٹ اور ابسٹریکٹ کی بات جہاں ختم ہوتی ہے اختر حسین جعفری کی نظم میں وہاں سے شروع ہی نہیں ہوتی بلکہ اس تفہیمی کلیشے کو کہیں پیچھے چھوڑ آتی ہے کیونکہ گندم کے ڈھیر جب اشکوں کے خرمن میں ڈھلتے ہیں تو صرف غم و الم کی علامت ہی نہیں بنے بلکہ صرف ایک مصرعہ کسان پر کیے جانے والے صدیوں پر محیط جبر کا نوحہ بن جاتا ہے۔ ابر برسیں گے اور ڈرائیں گے صرف بادلوں کی پرسونیفیکیشن ہی نہیں بلکہ بارشوں اور بجلیوں کی شکل میں قہر برسانے والے ان دیوتاؤں کی بھی یاد دلا جاتے ہیں جن کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کو اپنی اولادیں قربان کرنا پڑتی تھیں۔ جیسا کہ میں نے فلسفہ شاعری میں بیان کیا ہے کہ شاعری عشق اور غم جیسی کیفیات کی نہ صرف وضاحت کرتی ہے بلکہ انہیں معنویت بھی دیتی ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری میں غم انسان کے ساتھ کسی متوازی مظہر کے طور پر ایک لامتناہی ہستی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ جو کسی عظیم تخلیق کار کی طرح خالق بھی ہے اور قادر بھی، کسی مخلوق کی طرح مجبور بھی ہے اور کمزور بھی۔ جو ازل سے انسان کے اندر اور باہر ایک متوازی حیثیت سے حالت سفر میں ہے۔ ایک دل سے دوسرے دل تک، ایک شہر سے دوسرے شہر تک اور ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک گامزن ہے۔ غم کا یہ بیان کسی دوسرے شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ یہ وہاں بھی اتنا ہی آفاقی، وسیع و عریض اور لامتناہی ہے جہاں اختر حسین جعفری اسے "اے میرے غم" کہہ کر پکارتے ہیں اور وہاں بھی اتنا ہی بلیغ ہے جہاں وہ اپنی خوشبو کی صورت کشید کیے جانے کے لیے موجود ہے۔

"وہ روشنائی وہ خوشبوئے غم کشید کریں

مشامِ جاں نے جو قرطاس پر نہیں دیکھی"
(نظم آئینہ خانہ)

اختر حسین جعفری کے ہاں غم واندوہ ایک نظریہ حیات کے طور پر دکھائی دیتا ہے جو جو کسی محرومی، حسرت یا ناکامی سے پیدا ہونے والے ملال سے بڑی اور بلند حیثیت کا مالک ہے۔ ایک ایسی طاقت جو مایوسی کے بجائے خارجی اور داخلی کائناتوں کے درمیان نفسی وحسیاتی ربط سے پیدا ہونے والے افعال واعمال اور ان کے نتائج کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ نظم "اے میرے غم" کا موضوع دیکھ کے جدتِ فکر جیسی اصطلاح بھی تہی دامن نظر آنے لگتی ہے۔ اردو شاعری میں غم ہمیشہ خواہش اور توقع کے برعکس واقعہ ہو جانے سے پیدا ہونے والی کیفیت کے طور پر ملتا ہے لیکن یہ کیسا شاعر ہے جسے خود غم کی ناپرسانی اور محرومی کا دکھ لاحق ہو جائے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اپنے غم کی ناپرسانی کا شکوہ شاعر کو ہے بھی تو اس کا اظہار غم کی الگ اور خود مختار حیثیت کو تسلیم کرنے سے مراد کیفیت کا بطور ہستی ادراک رکھنے کا ثبوت دیتا ہے۔

"اے میرے غم"

جلتے مہر، خنک مہتاب کے رنگ سمجھتے،
تارِ نظر کی گرہیں کھولتے
ریشم بنتے عمر کٹی ہے
اے میرے غم! تیرے بدن کی عریانی کا،
تیری محرومی کا دکھ ہے
صبح دعا میں تیرا قاصد، تیرا مؤذن سب سے سچا
سب سے زیبا
شام وفا میں خالی لوٹتے ہر رہوار پہ تیری چادر
ہر چادر پر جتنا ہے خونناب، ترا ہے
حلقہ حلقہ کھلتے طوق پہ تیرے عجز کا اسم اعظم
اے میرے غم!
اے میرے غم شہرِ اقداراں کے بے افلاک ستارے؟
آخرِ شب کی تا گا تا گا ٹوٹتی ضو میں
تیری محرومی کا دکھ ہے!

.....

نظم میں ذاتی غم بے افلاک ستارے میں بدلتا خالی لوٹتے ہر رہوار کے بھرم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غم جب خیر کی طرف بلاتا مؤذن اور صبح دعا میں سچائی کا پیغام پہنچانے والے قاصد کا قصد رکھنے کے مرتبے پر فائز ملتا ہے تو اختر حسین جعفری کا غم کیفیت سے زیادہ نظریہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ اگرچہ غم اختر حسین جعفری کی شاعری کے مرکزے کے طور پر جا بجا اپنے موجود ہونے کا احساس دلاتا ہے لیکن نظم "امتناع کا مہینہ" میں خاص طور پر اس کی پاکیزگی اور تقدس کی شان دیکھنے والی ہے۔ غم کی ایسی معنویت اور مقصدیت اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان کے ادب میں نظر نہیں آتی۔

"امتناع کا مہینہ"

"اس مہینے میں غارت گری منع تھی، پیڑ کٹتے
نہ تھے تیر پکتے نہ تھے
بہر پرواز محفوظ تھے آسماں
بے خطر تھی زمیں مستقر کے لیے
اس مہینے میں غارت گری منع تھی، یہ پرانے
صحیفوں میں مذکور ہے

قاتلوں، رہزنوں میں یہ دستور تھا، اس مہینے
کی حرمت کے اعزاز میں
دوش پر گردنِ خم سلامت رہے
کربلاؤں میں اترے ہوئے کاروانوں کی
مشکوں کا پانی امانت رہے
میری تقویم میں بھی مہینہ ہے یہ
اس مہینے کئی تشنہ لب ساعتیں، بے گناہی
کے کتبے اٹھائے ہوئے
روز و شب بین کرتی ہیں دہلیز پر اور زنجیر در
مجھ سے کھلتی نہیں
فرشِ ہموار پر پاؤں چلتا نہیں
دل دھڑکتا نہیں
اس مہینے میں گھر سے نکلتا نہیں"

.....

اختر حسین جعفری کی شاعری میں سورج، چاند، لہو، خون، تارے، روشنی، سولی، تصویر، شب، سفر، فصیل، صبح، صبح کاذب، ندی، دریا، بادل، دیوار و در، چراغ، پانی، علم، قلم، گرداب، طناب، خیمہ، ہوا، سفر، بارود، پھول، درخت، دشت، زینہ، منبر اور ایسے ہی اَن گنت استعارے اور علامتیں اس کی کیفیات کی ترسیل کے لیے ایسی شعری فضا کو ترتیب دیتی ہیں جو معانی یا خیال کے ابلاغ سے پہلے کیفیت کے ابلاغ کا کام کرتی ہیں۔ یہ شعری وصف جہاں ایک طرف شاعری کو ایک انفرادی خوبی عطا کرتا وہاں معنی کے جلد ابلاغ میں رکاوٹ بھی بنتا ہے اور قاری کو نظم کے باطن میں اتر کر فکر کی گہرائی کو ماپنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح جعفری صاحب کی نظموں میں موجود تلمیحات کا پھیلاو انسانی تاریخ کے کربناک گوشوں کو موجود صورتحال سے منسلک کرنے کا ایسا ہنر ہے جہاں شاعر کی فکر تک رسائی شعر کے عام قاری کے بس سے باہر ہو جاتی ہے۔ تلمیح کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ واقعہ اور واقعے کے سیاق و سباق کے علم کے بغیر نہ خود کھلتی ہے نہ شعر کو کھلنے دیتی ہے لیکن اس کی آسانی یہ ہے کہ اگر قاری صاحب علم ہو تو تلمیح ایسی کھلتی ہے کہ ایک مصرعے کی تفہیم سے پورے واقعے بلکہ عہد، نظم کے موضوع اور مقصدیت کے منہاج وا کرتی چلی جاتی ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری میں تلمیح وہ دستاویزی ثبوت ہے جو مختارِ کل کی طرف سے کیے گئے صبحِ کاذب کے وعدے پر شب خون مارنے والی قوتوں کے برپا کیے جانے والے ستم سے پیدا ہونے والی بربادی کے خلاف شاعر کے پیش کیے گئے مقدمے کا استدلال فراہم کرتا ہے۔ میں یہ کہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ اختر حسین جعفری کی شاعری تاریخ انسانی میں برپا کی جانے والی قیامتوں اور بربادیوں کے خلاف ایسا مقدمہ ہے جو انسانی ضمیر کی عدالت میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسی عدالت میں جہاں ہمیشہ ثبوت بدل دیئے جاتے ہیں اور شہادتیں مسخ کر دی جاتی ہیں، مدعی کو مار کے گواہوں کو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ذاتی مفادات اور گروہی تحفظ کے لیے بنائے گئے قوانین اور آئین خون آشام بلاؤں کی طرح سچائی کو نگل جانے کے لیے ہمہ وقت تیار بیٹھے ہوں وہاں ایسا لافانی اسلوب ہی عالمی انسانی

جرائم کے خلاف نوشتہ و دیوار ثابت ہو سکتا تھا جو اختر حسین جعفری نے اپنایا۔ یقیناً ایک بڑا اور قادر الکلام شاعر ہی اپنی مرضی کے اسلوب کا اختیار رکھتا ہے۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اس کی کیفیات کے افشا اور فکر کے بیان کے لیے موزوں ترین الفاظ کونسے ہیں اور ان لفظوں سے تصویریں اور کردار بنانے کا کونسا قرینہ باطنی کائنات میں اٹھنے والے بھونچال کا منظر کامیابی سے تشکیل دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں نظم "آئینہ خانہ" بطور خاص دیکھی جا سکتی ہے۔ نظم کا آغاز ہی دعوتِ فکر سے ہوتا ہے۔ اس نظم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے سچائی سے خوفزدہ اور جبر مسلط کرنے والی اندھی قوتوں کی نفسیات اور ان کے طریقہ ہائے واردات جبر و ستم کو جاننا ضروری ہوگا۔ پھر حق پرستوں کے خدشات، امید، قید و بند اور قتال گاہوں کی تاریخ جاننا بھی لازم ہے۔ صلیبوں اور مصلوب کیے جانے والوں کی داستانوں سے آگاہ ہونا پڑے گا۔ اگر قاری ان معیارات پر پورا اترے گا تو وہ یقین کر لے کہ اس کے لیے اس نظم کے کیفیاتی، معنوی اور نظریاتی حصار سے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ آئینہ خانہ ایسی نظم ہے جو ہر قاری کو ساتھ لے کر نہیں چلتی لیکن اگر کسی کے لے کر چل پڑے تو زندگی بھر اس کے ساتھ رہتی ہے۔

اختر حسین جعفری نے بہت کم لکھا لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں موضوعات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جس کا شمار ایک علیحدہ مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ ہے کہ اختر حسین جعفری کی مختصرین ترین نظم میں بھی ایک سے زیادہ ضمنی موضوعات مل کے مرکزی موضوع کے بیان کی وضاحت میں مددگار کا کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے کم ترین بیان میں بھی موضوع کی ایسی وسعت پیدا ہو جاتی ہے جس کی تفصیل میں جائے بغیر نظم کی تفہیم ادھوری رہتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اختر حسین جعفری کی نظموں کے اندر نظمیں تخلیق ہوتی چلی جاتی ہیں تو یہ سچ بھی ہوگا اور ان کی تفہیم میں ممد و معاون بھی ثابت ہوگا۔ یہاں اشارتاً چند موضوعات کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ قارئین، ناقدین اور محققین کے لیے ایک مختصر اشاریے کا فرض ادا ہو سکے۔

انسانی لغزشوں کے شعور سے پیدا ہونے والی اداسی، غم، بے کلی۔
کلیدی منصب انسانی سے عہد شکنی۔
انسانی ذمہ داری سے انحراف۔
فطرت اور نظام فطرت سے بے وفائی۔
ریاکاری پر انسانوں کی رضامندی۔
خود فریبی سے زمانہ فریبی کا چلن
فطرت کے اصولوں اور موت کی حاکمیت کی نافرمانی۔
طاقت اور کمزوری کے عدم توازن سے پیدا ہونے والا خوف۔
دھڑکے اور انتظار کا بحران۔
تہذیبی جمال سے روگردانی۔
خیر اور شر کے تصادم کا المیہ۔
سماجی خلفشار اور اقدار کے انہدام سے پیدا

ہونے والا ہیجان۔
صورتحال سے پیدا شدہ کرب، بے بسی اور مایوسی کے خلاف مذاحمت۔
اور تاریخ انسانی میں برپا کی جانے والی کربلائیں۔

آخر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کے جعفری صاحب کی نظم آئینہ خانہ کا ایک مختصر اور اجمالی تجزیہ پیش کروں تا کہ نظم کی تکنیک اور اس کی تفہیم کے طریقہ کار کی وضاحت ہو سکے۔

''آئینہ خانہ''

ہر بڑا مفکر، فلسفی اور نظریہ ساز شاعر اپنی کلیت میں انتہائی مربوط اور واضح نقطہ نظر لیے ہوتا ہے جس کی جزیات کی وضاحت اسے بعض اوقات مختلف خارجی پیرائیوں اور کیفیاتی مداروں میں رہ کرنا پڑتی ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری کی کلیت بطور ایک ترقی پسند فلسفی شاعر کے سمجھنا مشکل نہیں۔ مظہر غم اور غم کے ماخذ کی نشاندہی، ترتیب وقوع ان کے شاعری کے تخلیقی پس منظر میں ایک متحرک قوت کے طور پر واضح ہے۔ غم کی سچائی، اس کی وسعت و گہرائی، خدا، کائنات، زندگی اور انسان کے ساتھ اس کے تعلق کی دریافت اور ہست کی معنویت اور مقصدیت کی بازیات اسی چشمہ غم سے پھوٹتے اور اختر حسین جعفری کی شعری فصلوں کی نشوونما کرتے ہیں۔ مظلومت اور محکومیت پر تخلیقی اظہار کے موسم ان کی تمام شاعری میں جس تسلسل سے سامنے آتے ہیں ان کی تفہیم کے لیے صرف زاویہ نظر کی درستگی شرط ہے ورنہ نہ کہیں ابہام ہے نہ وقت تفہیم۔ اگرچہ شاعری کی تفہیم و ادراک اولاً انفرادی احساساتی معاملہ ہے لیکن اپنی آفاقیت میں یہ بدرجہ اتم اجتماعی بھی ہے۔ لہٰذا یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ناقد کسی سطح پہ نصابی اور تدریسی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی ذاتی تفہیم کا اظہار بھی کرے اور قاری کو شریک بھی کرے۔

نظم آئینہ خانہ باب اول سے پہلے ایک تمہیدی بند سے آغاز ہوتی ہے۔ جس میں شاعر نے پوری کائنات کو ایک آئینہ خانہ قرار دیتے ہوئے اسے کذب و ریا، حسن و قبح، پاکیزگی و نجاست اور خیر و شر کا جاری و ساری آئینہ خانہ قرار دیا ہے ایک ایسا تسلسل جس میں زندگی کے حصے میں آگ اور راکھ کے ڈھیر سے غم کے ریزے چننے کے سوا کچھ بھی نہیں اور وقت کے دریا کے پاس اس آئینہ خانہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھنے اور حیران ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایک ایسا جہان جو خود کار ہے اور جس میں زندگی کے حصے جو کچھ آیا ہے وہ مصائب و آلام کی خشت کاری، آنسوؤں کی آبیاری اور بے بسی و لاچاری کا ایسا عکس ہے جس کے پاس اپنے حصے کے آئینے پر خراشیں ہی خراشیں ہیں یا پھر کرچیاں۔ نظم آئینہ خانہ کا یہ بند جہاں اس نظم کی تفہیم کے لیے بہت بنیادی نکتہ فراہم کرتا ہے وہاں شاعر کی پوری کائنات سخن کو سمجھنے کے لیے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ایک ایسا نکتہ جو کسی حرف اور لفظ کے بغیر بھی اپنا پورا جہان معنی رکھتا ہے اور خدا کی طرح اپنی معنویت کے لیے کسی سہارے کا محتاج

نہیں۔ ایک بات جو اختر حسین جعفری کی نظموں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انہیں داستان یا مثنوی کے موضوعاتی تسلسل کی عادت اور توقع سے نکل کر پڑھنا چاہیے۔ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہو یا راشد کی ''حسن کوزہ گر'' ان میں موجود موضوع کا تسلسل اور کہانی پن نظم کی تسلسل خیال کی تعریف پر تو پورا اترتے ہیں لیکن جدید نظم کی تعریف اب تسلسلِ خیال کی صفت سے آگے نکل چکی ہے۔ جیسے حسن کوزہ گر آزاد نظم تو ہے اور اپنے وقت کی جدید نظم بھی تھی لیکن تکنیکی اعتبار سے آج کی جدید نظم وحدت اور تاثر وحدت نظم کے پہلے باب نظم کے پہلے باب کا پہلا بند قاری کو نظام کائنات اور اس میں جاری و ساری معاملاتِ ہست و بود کی نشانیاں تلاش کرنے اور آثار جمع کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور دعوت فکر اعلامیہ ہے۔ دوسرے بند میں اس صاحبِ شعور سے تخاطب ہے جو حجاباتِ شاہد و مشہود کو اٹھانے کی قدرت رکھتا ہے کہ اختر حسین جعفری کے نزدیک شعر اور تفہیم شعر، شاعری سے سطحی شعری لذت حاصل کرنے سے زیادہ کشید غم سے تطہیر احساس کے عمل کا نام۔ تیسرا بند خود زندگی اور ہستیٔ موجود اور کارخانۂ ہست و بود کے مراحل کو سمجھنے میں شامل کرنے کی سعی کا اظہار ہے۔ چوتھے بند میں اس آئین کی تکمیل نہ ہو پانے کے کرب کا بیان ہے جس کا وعدہ ہر عہد میں انسان نے انسان سے کیا تھا۔ کبھی خدا کے نام پر، کبھی دیوی دیوتاؤں کا نام لے کر اور کبھی خود اپنا فریضہ ہستی بتا کر۔ پانچواں بند اسی سگِ مامور کے چہرے سے پردہ ہٹاتا ہے جو ازل سے انسان اور کائنات کو شر اور شر کے خوف کی صلیب پر لٹکاتا چلا آ رہا ہے۔ اگلے انیس بند آلام کی ایسی تدوین ہیں جو انسانی انتشار، مکانی انہدام اور زمانی عہد شکنی کے بطن سے جنم لینے والے کرائیسس کی تجسیم کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جبکہ پچیسواں اور آخری بند نظم کے کلائمکس کا سٹروک ہے جس میں نظم پھر اسی آئینہ خانہ کی طرف لوٹتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی اور درمیان میں جس کی رودادِ شکستگی کی جزیات بیان کی گئی ہیں۔ جب نظم کا موضوع ازل تا ابد انسانی کائنات اور اس کائنات کی داخلی و خارجی تاریخ کا اندوہ ہوگا تو اس نظم کے خالق سے میر اور ناصر کاظمی کے اسلوب کی توقع رکھنے سے زیادہ بہتر ہے کہ اسے غالب کے قرینۂ اظہار کے قریب رکھ کر سمجھا اور پرکھا جائے۔

اختر حسین جعفری نے اردو ادب کو ایک ایسا شعری جہان عطاء کیا ہے جس کی تہ در تہ معنویت عہد بہ عہد منکشف ہوتی رہے گی اور خوش نصیب صاحبان احساس زمانوں تک اس سے لطف و شعور کشید کرتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

ادرا کی تنقید کے حوالے سے جناب فرحت عباس شاہ کا مضمون حاضر خدمت ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی بیاض، دوست اپنی رائے دینا چاہیں تو یہ گوشہ حاضر ہے۔ [مدیر]

درد کا آخری طواف

درد کو عشق کی انتہائی منزلوں میں سے ایک مانا گیا ہے۔ عشق کی پہلی منزل رغبت، دوسری محبت اور تیسری عشق کہلاتی ہے، جنوں یا دیوانگی کا مرتبہ عشق کی اُس سرحد سے جڑتا ہے جس کی انتہا درد ہے۔ اور درد جب انتہاؤں کو چھونے لگتا ہے تو ان لمحوں میں طواف اپنے مقام سرمدی کا آغاز کرتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ''درد کا طواف اور وہ بھی آخری طواف' دراصل عشق ہی کے اپنے طلسماتی اور معجزاتی درجے ہیں جو معشوق ومحبوب کے مابین اپنے اپنے اظہارات کا تقدس مآب جہاں اور امتیاز رکھتے ہیں۔ روحانی یا ماورائی جہانوں سے اوھر یہ جو جہانِ فانی ہے اس کی حدِ امکانی میں موجود مقاماتِ آہ و فغاں میں بھی درد اور درد کے طواف کی اپنی اپنی منزلیں اور اپنے اپنے درجے ہیں۔

زیرِ نظر کہانیوں کے اس مجموعے میں درد اور طواف سے ہم رشتہ کیفیات اپنی متنوع صورتوں میں کرداری رنگارنگی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ مجموعے کے سرنامے ''درد اور طواف'' میں لفظ ''آخری'' نے لفظ ''درد'' سے اشتراک کے نتیجے میں زندگی کو نئی معنویت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ درد کا طواف اور وہ بھی درد کا آخری طواف ___ اس آخری طواف سے جو حیرت اور پُراسراریت پھوٹتی ہے، جو ڈرامائی کیفیت جنم لیتی ہے، وہ اس مخصوص کہانی میں اس مجموعے کی سبھی کہانیوں کے تار و پود میں دوڑتی اور روشنی بانٹتی دکھائی دیتی ہے۔

یہ کہانیاں اپنے موضوعاتی، فکری اور نظریاتی برتاؤ اور پیش کش کے مجموعی معیار کے اعتبار سے کہانی پن کے فطری جمال سے مالا مال ہیں۔ ان کہانیوں میں بنی نوع انسان سے درد کے رشتے کا احساس فنکارانہ بصیرت افروزی کا امتیاز لیے ہوئے ہے۔ اپنے سماج، دسیب، ماحول اور اپنے دکھی اور مجبور لوگوں سے درد کا یہی اشتراک ہمارے خوش فکر شاگرد عزیز اور من موہنے کہانی کار حکیم عبدالرؤف کیانی کے اسلوب کا اختصاص ہے، جس کی تحسین کی جانی چاہیے۔ سو میں کھلے بازوؤں اور مچلتے دل کے ساتھ ان کی اس افسانوی کاوش کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

نثار ترابی

جس قدر سانس لیے اتنی غزل خوانی کی

عرفان صادق بلاشبہ ان شاعروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جن کی غزل میں کچھ مستقل اور مسلسل موضوعات فکر و تخیل کے امتزاج سے بیان ہوئے ہیں۔ غزل چوں کہ کلاسیکی روایت کی وارث ہے۔ اس لیے قافیہ پیمائی سے قطع نظر فن کے ضابطوں سے آگہی اور ان کی پیروی کا تقاضا کرتی ہے یہاں تک کہ غزل میں جذبات کا اظہار بھی فنی اور تہذیبی پابندیوں سے مشروط ہے یا یوں کہیے کہ یہ جذبے اور عقل کے توازن کا تقاضا کرتی ہے اس کے فنی اجزا میں جذبے پر عقل کا، موضوع پر ہیت کا اور ہیت پر تخیل کا غلبہ ہوتا ہے۔ عرفان صادق کی غزل بھی اپنے غالب میلانات کے باعث کلاسیکیت کے شعور کی حامل ہے۔ تاہم بعض تصورات اور موضوعات کی بنا پر عرفان صادق کے یہاں رومانیت کے اجزا و عناصر بھی وافر ملتے ہیں بالخصوص رومان و انقلاب کی خواہش، جدید تر موضوعات کا انتخاب، خالصتاً ذاتی واردات کا اظہار، جذبے اور تخیل میں زبردست بہاؤ انہیں رومانیت کے قریب کرتا ہے مگر اس کے متوازی ان کے جذبات و احساسات تہذیب کی مقرر کردہ حدود کو تسلیم کرتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ دور جدید میں جہاں روایت اور تاریخی شعور ناگزیر ہے وہاں انفرادی تجربہ، عمیق نظری اور عصری حالات کا تجربہ بھی ضروری ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے روایت اور انفرادی تجربے کے امتزاج پر مبنی تخلیقی اظہار کو اچھی شاعری کی پہچان قرار دیا تھا۔ عرفان صادق کا تخلیقی مزاج فن کے تقاضوں سے آشنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ضبط و اضطراب حقیقی معنوں میں ہی برتتے ہیں جیسے ہمارے یہاں آئینہ، چراغ، ہوا، جسم، روح، صدا، دشت و صحرا، خواب و اضطراب جیسی لفظیات کو فیشن کے طور پر تصوف کی واردات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور ایسا شاعری کی روایت میں ہر زماں ہوتا رہا ہے۔ عرفان صادق ان لفظیات کو تاریخی، سیاسی اور سماجی عمل کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان سے وہی معنی مراد لیتا ہے جس میں ہمارے زمانے کی تلخ و شیریں، دکھ سکھ، خوف و ہراس، آس نراس، دشت و وحشت، غیب و ظاہر، معلوم و نامعلوم، امید

نجیب جمال

ونا امیدی، خواب و اضطراب، اداسی، ویرانی اور سناٹے جیسی صورت احوال کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کی انسانی صورت احوال سے واقف ہے اس لیے کسی ماورائے ادراک واردات کو بیان کرنے کے بجائے اپنے سامنے کے مناظر پر نظر رکھتا ہے، اپنے لہجے کی قوت سے کام لیتا ہے اور بڑے حوصلے اور طاقت کے ساتھ اداسی کی جمالیات کو ظاہر کرنے پر قادر نظر آتا ہے وہ خیال کی باریکی یا نزاکت کے بجائے لطافتِ خیال کو مجروح کیے بغیر صلابتِ اظہار کا قائل ہے اور اسی طرز کو آخر تک نبھاتا ہے۔ ان کے مجموعے "زخمِ ہنر" کی شاعری آہنگ کے تیور سروں پر مبنی ہے۔ اس میں شدت اور بلند آہنگی کی صورت وہ کبھی ترکیب سازی سے اور کبھی امیجز تراش کر پیدا کرتا ہے۔ یہ شاعری اداسی، مایوسی اور دکھ کے احساس کو بیان کرنے کے باوجود اپنی اصل میں اثباتی ہے۔ پہلے یہ اشعار دیکھیے کہ جن میں وہ پرندے اور شجر کے تعلق سے کئی موقعوں پر بچھڑنے، جدا ہونے، کوچ کر جانے، کٹ کر گر جانے، سہم کر اداسی کی تصویر بن جانے، منڈیروں پر لہو بکھر جانے کے مناظر دکھاتے ہیں:

میں تھا اداس، پیڑ تھے اور سوگوار شام
پنچھی جو جا رہے تھے مرا گاؤں چھوڑ کر

.....

شجر کو دیکھ رہے ہیں زمیں پہ گرتے ہوئے
اب اس سے بڑھ کے بھی ہوگی سزا پرندوں کی؟

.....

پرندے سوگ میں بیٹھے ہوئے ہیں اس دن سے
ہوا نے کس لیے پیڑوں سے بے وفائی کی

.....

یہ بات میں نے سنی ہے ضعیف پیڑوں سے
پرندہ شاخ اکیلی سے جو، گیا سو، گیا

.....

آنگن سے پیڑ جو کٹا تقسیم کے لیے
مت پوچھ کتنا چڑیوں نے صدمہ اٹھایا ہے

.....

گھلے ہوئے ہیں ہواؤں میں نوحے چڑیوں کے
خزاں کی زد پہ ہیں آئے ہوئے شجر میرے

.....

پرندے کوچ کرتے جا رہے ہیں
منڈیروں پر لہو بکھرا ہوا ہے

.....

پیڑوں کو اس طرح سے نہ کاٹو، ذرا رکو
لوگو! یہ آخری ہیں سہارے زمین کے

پنچھی شجر کی شاخ سے جو کر رہے ہیں کوچ
شاید سمجھ چکے ہیں اشارے زمین کے

.....

ایسے مرجھائے ہیں سب خواب مری آنکھوں میں
جیسے چپ چاپ درختوں پہ خزاں آتی ہے

.....

مری باتوں کی پرندے بھی گواہی دیں گے
کتنی بے دردی سے اشجار کا خوں ہوتا ہے

.....

یہ سب اشعار اس بار کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ عرفان صادق کے نہیں بلکہ اپنی زمین، اپنے اشجار، اپنے لوگوں کی محبت میں مبتلا کسی عاشقِ صادق کے ہیں۔ یہ اشعار وہی کہہ سکتا ہے جو شہروں کے چیختے مناظر کو دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ یہاں اب شاید کوئی ایک بھی محبت میں مبتلا نہیں رہا، اس لیے تو گھروں میں، دیواروں پر اور منڈیروں پر اداسی کا ڈیرہ ہے۔ عرفان صادق چاہتا تو وہ ایک بھی ماورائے ادراک و احساس فضا تشکیل دے سکتا تھا لیکن وہ تو خالصتاً انسانی صورت احوال اور سماجی عمل پر یقین رکھتا ہے اپنی نہاد میں وہ ایک امید پرست ہے۔ شجر ہی کے امیج کے ذریعے وہ آنے والے اچھے دنوں کا استقبال کرتا ہے:

نشہ برسات کا چھانے لگا ہے
خوشی سے پیڑ لہرانے لگا ہے

.....

جو پیڑ کھوکھلا ہوتا نہیں ہے اندر سے
گرا سکیں گی یہ پاگل ہوائیں کیا اس کو

.....

لدی پھرتی ہیں خوشبو سے ہوائیں
پرندوں سے شجر مہکا ہوا ہے

.....

عرفان صادق کا ایک اور مسلسل موضوع اداسی کی جمالیات کو بیان کرتا ہے۔ یہ موضوع اس کے یہاں دیگر کئی ضمنی موضوعات بھی رکھتا ہے جیسے مایوسی، تنہائی، خوف، ناامیدی، شکستِ صدا، یادوں کی اڑتی ہوئی گرد اور ترسنے کی کیفیت جیسے حوالے بھی اپنی اپنی معنویت کے ساتھ ان کے اشعار میں جا بجا ملتے ہیں۔ خاص طور پر خوف، ہراس، ڈر، ظلمت جیسے مناظر ہماری سیاسی و سماجی زندگی کے ان تمام حوالوں کے ساتھ ملتے ہیں جو اشک آنکھوں میں چھپائے، ضبط کے قرینوں کو آزمانے اور ساون کے مہینے کو منانے کے لیے کیے گئے جتن سے عبارت ہیں۔ اس مجموعے میں تین غزلوں میں اداسی اور اداس کو ردیف کے طور پر برتنے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق کار کی اس موضوع سے رغبت کیا ہے۔ پہلے ان غزلوں کے یہ اشعار دیکھیے:

اس لیے ہے درختوں پہ کپکپی طاری
پرندے بول رہے ہیں زباں اداسی کی

.....

جہاں یہ لفظ کے سکے سخن میں ڈھلتے ہیں
ضرور ہوتی ہیں پریاں وہاں اداسی کی

.....

ہر ایک عکس اداسی میں ہے نہایا ہوا
مری طرح سے ہے یہ آئینہ اداس اداس

.....

پسِ یقیں سرِ وہم و گماں اداسی ہے
مرے خمیر میں شاید نہاں اداسی ہے

.....

یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ غزل کی فضا بنانے میں ردیف کا بنیادی حصہ ہے جب کہ قافیہ مضمون کے تنوع کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اداسی کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ ہم اپنے اجتماعی لاشعور کا کھوج لگائیں تو سیاسی و سماجی تاریخ کے سارے گوشے واقعات اور مدوجزر اردو شاعری کا حصہ رہے ہیں۔ اردو شاعری نے برصغیر کی پچھلے سات سو سال کی تاریخ اور تہذیب کے متوازی لحہ لحہ سفر کیا ہے اور اس عرصے میں رونما ہونے والے تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے حوادث کے تلخ و شیریں کا مزہ چکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو سے آج تک اردو شاعری میں گزشتہ سے پیوستہ ادوار میں زندگی کی سانسیں تک گنی جا سکتی ہیں یوں اردو شاعری زندگی، فن اور تہذیب کے تسلسل کا حوالہ ہے۔ یوں اردو شاعری میں زندگی کے المیوں کے ساتھ سرشاری اور بامرادی کے تصورات بھی توازن کے ساتھ موجود رہے ہیں۔ یہاں غم و شادی کی حالت کے مرقعے جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے میر کو یونہی نشاطِ غم کا شاعر نہیں کہا تھا۔ ولی نے ''راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں'' کہہ کر قیامت تک راہِ سخن کے بند نہ ہونے کی نوید تھی۔ بیسویں صدی میں جگر مرادآبادی کا کہا بھی سچ نکلا کہ:

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سنا تا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

.....

اردو شاعری کا تکلمی مزاج بھی متوازی طور پر بلند آہنگ اور گلوگیر لہجے سے پہچانا جاتا ہے۔ عرفان صادق نے جس اداسی کی تہذیب کو زندہ رکھا ہے اس میں بھی توانائی، لطافت، وردآشنائی، ضبط و احتیاط اور الفت کے تقاضوں کے مطابق اداسی، مایوسی اور تنہائی کے مضمون کو بھی جمالیاتی آہنگ میں اس طرح منقلب کیا ہے کہ جدائی سمیت ہر دکھ کو سلیقے سے بیان کر دیا ہے۔

دشت در دشت لیے پھرتی ہے وحشت ہم کو
جانے کس موڑ پہ لے آئی محبت ہم کو

.....

اب گریباں کی خیر مانگتا ہوں
ایک وحشت ہے چار سو میرے

.....

دیکھا ہے اسے جذب کے کس حال میں صاحب
اک عالمِ حیرت تری تصویر سے نکلا

.....

عرفان صادق کے یہاں تنہائی، ڈر، خوف، اداسی، امید و ناامیدی، وہم و یقیں اور کرب آشنائی کی یہ صورتیں بھی دیکھیے۔ ان اشعار میں جدید دور کے فرد کا کرب نمایاں

دکھائی دیتا ہے:

ساکت کھڑا ہوں دھوپ کی بارش میں اس لیے
لایا گیا ہوں برف کی وادی سے موڑ کر

.....

اک خوف ہے جو دامنِ دل چھوڑتا نہیں
اک خوف ہے جو لپٹا ہوا ہے یقیں کے ساتھ

.....

جھلس رہی ہے مسلسل قبا پرندوں کی
قبول کس گھڑی ہو گی دعا پرندوں کی

.....

مجھے یہ ڈر ہے مرے خواب نہ بکھر جائیں
اگر یہ رات سکوں سے گزار لی میں نے

.....

وہ بے وفا سہی لیکن وفا شناس بھی ہے
اسی لیے تو یہ دل خوش بھی ہے اداس بھی ہے

.....

ضبط کے سارے قرینوں سے شناسا ہوں مگر
اشک آنکھوں میں چھپاتے ہوئے رو پڑتا ہوں

.....

دور تک پھیلے ہوئے وہم کے صحراؤں میں
اک ذرا عزم و یقیں ہو تو دیے جلتے ہیں

.....

اداس رنگوں سے ساری فضا نہائی ہوئی
عجیب کرب سے اس بار آشنائی ہوئی

.....

بیٹھے ہیں خامشی کے الاؤ میں اس لیے
اپنی صدائیں خود کو سنانے کے واسطے

گھلا ہوا ہے ہواؤں میں اک عجیب سا ڈر
یہ کیسی رات ہے سارے مکیں مکاں سے گئے

.....

عجیب امر ہے کہ عرفان صادق نے شاید اپنے نام کی رعایت سے بیشتر لفظیات، علامات اور تراکیب عرفان و سلوک سے اخذ کی ہیں مگر انہیں باطنی واردات کا ذریعہ بنانے کے بجائے انسان کی نا آسودگیوں، آرزوؤں اور حسرتوں کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور اپنی دونوں آنکھوں سے اتنا ہی دیکھا ہے جتنا وہ دیکھ سکتا تھا نہ اس کی آنکھ اندر کی طرف کھلتی ہے نہ وہ دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور نہ ہی اس کا پورا قلب آنکھ بن کر محوِ نظارہ ہوتا ہے اور جہانِ حیرت کے در وا کرتا ہے وہ تو اپنی اس آنکھ سے دیکھتا ہے جو باہر کی طرف کھلتی ہے، باہر کی دنیا کے ان منظروں کو دیکھتی ہے جن کا مشاہدہ اسے ہمہ وقت کسی نئے تجربے سے آشنا کرتا ہے اس دیکھنے کے عمل میں کبھی کبھی حیرانی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے اور وہ بار بار دیکھنے کی تمنا کرتا ہے۔ اپنے معروض تک پہنچنے کے عمل سے اسے سہولتِ اظہار کی معاونت حاصل ہے۔ خواب دیکھنا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا اضطراب، والہانہ پن، وصل کا تصور، تھرتھراتی ہوئی آنکھ کی لو، آنکھوں سے بہتا فرات، ربط و ضبط و احتیاط، آنکھوں کی منڈیروں پر اتارا ہوا

غم، تحیر آمیز نقش، آئینے کا انعکاس سب کسی ماورائی دنیا کے نہیں اسی جہانِ خراب کے منظر ہیں تاہم اس میں محبت کی کرامات کا وصل ہے:

اک تحیر ہے میرے چاروں طرف
نقش در نقش آئینہ ہوں میں

.....

چلے ہو سامنے لیکن یہ احتیاط رہے
یہ آئینہ ہے یہ چہرہ اچھال دیتا ہے

.....

ہاں یاد ہے دریا کے اترنے کا وہ منظر
ہاں دیکھی تھی میں نے کبھی روتی ہوئی آنکھیں

.....

اک رنگ کے اک نور کے دھارے سے بندھے ہیں
ہم تو تری آنکھوں کے اشارے سے بندھے ہیں

.....

اب نہ نکلوں گا محبت کی گھنی چھاؤں سے
زندگی سے یہ مرا آخری سمجھوتہ ہے

.....

اپنے قدموں سے نظر ہٹتی نہیں ہے میری
کوہساروں کی طرف دیکھنے والا میں کون

.....

روشنی اوڑھے وہ جب خواب میں آجاتا ہے
عکس خورشید کا مہتاب میں آ جاتا ہے

.....

وصل کے خواب سمیٹے یونہی دھیرے دھیرے
سلسلہ آنکھ کا برسات سے جا ملتا ہے

تھرتھراتی ہے مری آنکھ میں خورشید کی لو
میرا ہر خواب میری رات سے جا ملتا ہے

.....

اس لیے آنکھ سے بہتا ہے شب و روز فرات
سلسلہ عشق میں سادات سے جا ملتا ہے

.....

اے مری آنکھ کے پانی میں نہائے ہوئے شخص
تجھ کو معلوم نہیں ضبط کہاں ٹوٹتا ہے

.....

ہم نے ساون کے مہینے کو منانے کے لیے
اپنی آنکھوں کی منڈیروں پہ اتارا تراغم

.....

عرفان صدیق کے یہاں امید و بیم، شکست و فتح، یقین و گماں، فنا و ثبات، ظلمت و نور، وصال و ہجر، دعا و دعا، ضبط و اضطراب کے مضامین ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں تاہم چراغوں کی آخری سانسوں سے وہ سورج نکال لاتا ہے۔ اپنے خیال و فکر سے کہیں گلاب کی خوش بو تو کہیں اجالا کشید کرتا ہے۔ اپنے تحیر عشق سے آئینے بناتا ہے۔ خوابوں کی تدفین کر کے بھی سرچشم ایک نیا خواب پیدا کر لیتا ہے۔ ''زخمِ ہنر'' خود غالب کے ''زخمِ جگر'' کی سی معنویت کا حامل ہے۔ اس مجموعے کی آخری دو غزلیں خصوصیت کے ساتھ امید و نشاط کے تصور سے مزین ہیں۔ پہلے ایک شعر ان کے مجموعہ شاعری ''ابد آباد'' سے دیکھیے اور پھر ''زخمِ ہنر'' سے کچھ

اشعار دیکھیے:

بدن میں روشنی اتنی اکٹھی کر لی ہے
میں اپنے ماتھے سے سورج اگانے والا ہوں
(ابد آباد)

بتا رہی ہیں چراغوں کی آخری سانسیں
شبِ سیاہ سے سورج نکلنے والا ہے
(زخمِ ہنر کی پہلی غزل سے)

اک تحیر ہے میرے چاروں طرف
نقش در نقش آئینہ ہوں میں

آخری دو غزلوں کے اشعار میں اثبات خیال و فکر و معنی کی صورتیں ملاحظہ ہوں:

وہ دیکھ کر مری آنکھوں میں مسکرانے لگا
گلوں کو موسمِ خوش رنگ گدگدانے لگا

ابھی تو خواب کی تدفین کر کے آئے تھے
کہ ایک خواب سرِ چشم سرسرانے لگا

مجھے یقیں تھا کہ اب بجھ چکی ہے آتشِ عشق
پھر اک شرارہ مرے دل میں سر اٹھانے لگا

وہ پور پور اترتی ہوئی وصال کی آنچ
جلا رہی ہے مسلسل ترے خیال کی آنچ

یونہی رہے گا تو مجھ میں چراغ سا روشن
کبھی بھی کم نہیں ہوگی ترے جمال کی آنچ

کھلیں رہیں ترے رخ پر بہار کے موسم
کبھی بھی چھو نہ سکے قریۂ زوال کی آنچ

.....

عرفاق صادق کا پیشِ نظر مجموعے شعر "زخمِ ہنر" تمام تر غزلوں کا مجموعہ ہے اس سے پہلے بھی "ابد آباد" غزلوں کا مجموعہ تھا تاہم اس مجموعے کا دیباچہ انہوں نے خود نظم کی صورت میں لکھا تھا۔ اس نظم میں بھی انہوں نے غزلوں کے مضامین، سہمی فضاؤں، ہواؤں میں بارود کی بو، پرندوں کی اڑان، درختوں کی شاخوں سے کوچ، مقدر کے اندھیروں، آنکھوں میں اداسی کے ساگروں، جلتے بجھتے دیوں، اڑتے ہوئے پتوں، بے یقیں ساعتوں کے ساتھ ساتھ موسموں کے بدلنے کے یقیں، شجر کی شاخوں میں رنگ اترے، خوشبوؤں کو سانسوں میں اور حاشیوں میں نئے رنگ بھرنے، آئینے سے کدورت کی مٹی ہٹانے اور تتلیوں کے پروں پر محبت کے نغمے لکھتے رہنے کا ادعا ملتا ہے۔ تاہم یہ سب موضوعات "ابد آباد" اور "زخمِ ہنر" کی غزلوں کا حصہ ہیں اور تغزل کی صورت بیان ہوئے ہیں۔ غزل سے عرفان صادق کو خصوصی رغبت ہے اور وہ آشنائے فن ہو کر غزل لکھتا ہے۔ غزل کہنا اس کے لیے سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے:

اور کیا پیش کروں فن سے محبت کے ثبوت
جس قدر سانس لیے اتنی غزل خوانی کی

☆☆☆☆☆

فیض اور اقبال..... چند مماثلتیں

غالب کے بعد اقبال اور اس کے بعد کون ہے جس نے ان دونوں شعرا کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر قبول نہیں کیا۔ مگر جیسے کہ میر انیس اور دبیر کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ یہ شعرا خود ہی اپنے طرز کے شارع اور منزل ہیں۔ جس نے ان کے رنگ و روش کو اپنایا اس نے اپنی شناخت کھو دی۔ علامہ اقبال کے پیش روؤں کے ساتھ بھی یہی سانحہ ہوا ہے۔ جس نے ان جیسا شعر لکھا وہ شعر اقبال کے نام سے منسوب ہو گیا۔ مثال کے طور پر:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

.....

ویسے تو ہر بڑے شاعر کے کھاتے میں کچھ الحاقی کلام ہوتا ہے۔ امیر خسرو، میر، غالب کے منسوب بہت سے اشعار ان ادا مر واقعی کی مثال ہیں۔ اس تفصیل کا یہ محل نہیں۔ یہ اقبال کا کمال تھا کہ انھوں نے مولانا حالی اور اکبر کی فکر کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اسلوب میں اپنا نام اور مقام بنایا۔ اپنی ایک الگ سے شناخت بنائی۔ ان کے بعد کے شعرا میں فیض احمد فیض کا نام آتا ہے کہ انھوں نے اقبال کی مکمل اور مسلسل پیروی نہیں کی بلکہ اقبال کے بیان کردہ مباحث اور مسائل کو نئے سرے سے زیر بحث لانے سے گریز کرتے ہوئے ان کے مطمع نظر اور ان کی فکر کو عصر حاضر کے مسائل اور مطالبات سے ہم آہنگ کر کے اپنی الگ شناخت قائم رکھی مثال کے طور پر علامہ اقبال کے مطمع نظر -- اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی کے حصول کے لیے انھوں نے قدم آگے بڑھایا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ اصلاح احوال کے لیے نئے دور کے نئے تقاضے ہیں۔ محبت کے فروغ اور اخوت کی فراوانی کے لیے ان کا اسلوب اور انداز دیکھیے:

محمد ظہیر بدر

ان گنت صدیوں سے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی ان روح کے ناسوروں سے

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

.....

دراصل فیض اپنے اردگرد نیرنگیٔ حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے وہ رنگینیٔ زمانہ کے روپ میں اپنے علامتی محبوب سے دوٹوک اس کیفیت دروں کا اظہار کرتے ہیں۔ شاعر اور سیاست دان میں واضح فرق یہ ہے کہ سیاست دان عوام کے مطالبات پر نظر کرتا ہے جبکہ شاعر عوام کے احساسات اور ان مسائل پر دھیان دیتا ہے۔ جن کا ٹکاس مطالبات کی صورت میں ہوتا ہے۔ سیاست دان لوگوں کو دکھانے کے لیے آنسو بہاتا ہے۔ شاعر لوگوں کی راحت کا سامان پیدا کرنے کے لیے ان کی حالت زار پر چھپ چھپ کر روتا ہے۔ فیض بھی اس معروضی حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں طبقے دو ہی ہیں ایک جو ظلم کرتا ہے اور دوسرا جو ظلم سہتا ہے۔ کبھی کبھار فیض بھی اس معاشی عدم مساوات اور سماجی ناانصافی سے گھبرا جاتے ہیں۔ جہاں اقبال کہتے ہیں:

اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

.....

یہ شکوہ فیض نے ان الفاظ میں کیا ہے:

بے دم ہیں بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم کیسے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

.....

فیض کے گلے کا لہجہ اقبال کے شکوے کے برعکس تیکھا زیادہ ہے مگر اقبال کی طرح فیض بھی حاکم حقیقی ہی سے گلہ کر رہے ہیں (کون کہتا ہے کہ فیض کفر والحاد اور لادینیت کا پرچارک ہے) مگر واقعہ یہ ہے کہ فیض کی شخصیت اور شاعری پر امیر مینائی کا یہ شعر صادق آتا ہے:

خنجر چلے کہیں پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

.....

ان کے ہاں فرد کے بجائے معاشرے کے دکھوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجزیے اور تجربے کو محبت کے معروف جذبے کو

علامت بنا کر وسیع تر تناظر میں اختیار کیا ہے۔ اسی لیے ابتداً ہم نے کہا تھا کہ انھوں نے محبت کے ارکانِ ثلاثہ اور رموز و علائم اور تلازموں کو فرد کے بجائے معاشرے کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ وطن ان کے ہاں لیلائے وطن، عوام عشاقِ وطن اور حکومتیں رویے رقیب کے طور پر جلوہ گر ہیں۔ فیض کے نزدیک اہلِ وطن کی خوشحالی وطن کی ترقی کی دلیل ہے۔ عشقِ حقیقی میں عاشق اپنے معشوق سے پیار کرنے والے (رقیب) کو روسیاہ کہنے کے بجائے حرزِ جاں کہتا ہے جبکہ عشقِ مجازی میں تو رقیب کی محبوب سے گفتگو بھی گراں بار لگتی ہے بقول غالب:

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے روبرو تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

....

جس طرح عاشق اپنے معشوق پر فدا ہوتا ہے دلے قدمے سخنے درہے اپنے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر محبوب کی رضا کے مطابق اپنی نفی کرتا ہے۔ فیض کہتے ہیں کہ وطن کے لیے اہلِ وطن کا رویہ ایک سچے عاشق کا ہونا چاہیے۔ اقبال کے ہاں بھی وطن کا ایک وقت تک ہی تصور تھا مگر پھر یہ تصور --- ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا (ترانۂ ہندی) سے --- مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا (ترانۂ ملی) پر محیط ہو گیا اور وطنیت کے جدید تصور کے بارے میں انھوں نے کہا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

....

فیض کے ہاں وطن کا تصور جہاں دکھی انسانیت سے جا ملتا ہے وہاں اقبال کے تصورِ وطن اور برناڈ شا کے طبقاتی تقسیم کے تصور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ساحر نے کہا:

چلو کہ آج کہیں پائمال روحوں سے
کہ آؤ اپنے ہر اک زخم کو زباں کر لیں
ہمارا راز تمہارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ ہمارے زمانے کو رازداں کر لیں

....

یہ الگ بات کہ فیض نے اپنی شاعری میں اسلام، مسلمان اور خودی کے فلسفے کو لفظی طور پر استعمال نہیں کیا اور کرتے بھی کیسے جیسا کہ عالمِ اسلام اور اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی فلاسفہ کی مجرمانہ تساہل نے قوم کو منتشر الخیال کر رکھا ہے (جس کا تفصیلی تذکرہ گذشتہ سطور میں کیا گیا) اس میں ایسی کون سی بات ہے جسے اقوامِ عالم کو بطور نظیر پیش کیا جائے۔ جہاں تک اسلام کی آفاقیت کا تعلق ہے اس کا نعرہ اقبال سنا چکے فیض نے چبائے ہوئے نوالوں کو چبانے کے بجائے پرانے سانچوں میں افکارِ تازہ اور مسائلِ کہن کو سمویا اور ان مسائلِ کہن کا علاج وہی تجویز کیا جو کہ اقبال نے اسلامی فکر کی روشنی میں کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا ، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

.....

مگر ایک طرف یہ بھی معاملہ ہے کہ:
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
اقبال نے کہا:
کب ڈوبے کا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

.....

فیض نے بھی سماجی و معاشی و معاشرتی انصاف کو اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی کا ذریعہ قرار دیا۔ فیض نے اسلام اور مسلمان کے بجائے انسان اور خلق خدا کی بات کی۔ ''دست صبا'' میں ان کا ترانہ۔ غربت و جبر و استبداد کی چکی میں پستے ہوئے لوگوں کے لیے امید اور امنگ پیدا کرنے کے لیے پورے کے پورے مسلمان اور اسلامی فکر اور ایمان کامل کا مظہر ہے۔ اس نظم میں رموز و طلازمے اور تلمیحات سب قرآنی ہیں، آسمانی ہیں۔ بقول اعجاز خاور ''یہ ترانہ قومی حمیت اور ملی غیرت کا جس قدر مضمون اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس سے کہیں زیادہ اپنے اندر خدا شناسی اور تقویٰ کی گہری چھاپ رکھتا ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ میں مشیت الٰہی کا اظہار و اعلان موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے ---
جو لوحِ ازل پہ لکھا ہے، جس دن کا ہم سے وعدہ ہے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں روئی کی طرح اڑ جائیں گے۔
جب خلق خدا کے کعبے سے سب بت اٹھوائے جائیں گے۔
ہم اہل صفا مردود حرم، مسند پہ بٹھائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا -- جو غائب بھی ہے حاضر بھی جو منظر بھی ہے ناظر بھی۔
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو۔
جب راج کرے گی خلق خدا جو میں بھی ہوں جو تم بھی ہو
-- ہم دیکھیں گے۔

.....

جس طرح اقبال کا انداز کہیں کہیں خطیبانہ اور ناصحانہ ہو جاتا ہے فیض کا انداز خطیبانہ نہیں البتہ ان کی شاعری اپنے قاری کو لاشعوری سطح پر وطن کی محبت کو ترجیح دینے پر اکساتی ہے، وہ اپنے قاری کو اشاروں کنایوں میں نظریۂ محبت پر نظر ثانی کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان اگر لمحاتی آسودگی اور عارضی تلذذ کے لیے حد سے گزر سکتا ہے۔ وہ اس کی صلاحیت رکھتا ہے تو کیا وہ خود بینی، خود پسندی اور خود نگہداری کے بجائے خلق خدا

کے چہرے پر خوشی کی ایک جھلک کا سامان پیدا کرنے کے لیے یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی تو منشائے الٰہی ہے۔ فیض اسی طرح حریت فکر اور افراد کو اجتماعی حوالے سے اپنی انفرادی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔

مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

.....

اقبال، اکبر دحالی کے سیاسی اور قومی مضامین کے علاوہ میر و غالب اور مومن اور داغ کی کلاسیکیت بھی فیض کے کلام کا رنگ ہے جس کی وجہ ان حضرات کا تتبع نہیں بلکہ مفرس کلاسیکی روایت سے ان کی وابستگی اور خوشہ چینی ہے۔ گویا اقبال کی طرح فیض قدیم و جدید شاعری کی روایتوں کے بھی امین ہیں۔ انھوں نے دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح روایت سے رشتہ نہیں توڑا مگر محبت السنہ شرقیہ کی شاعری کا محور ہے۔ فیض نے اپنے فکری منشور اور ادبی مسلک کے تحت اسے بطریق احسن برتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امن و آزادی بڑی حسین اور تابناک چیزیں ہیں۔ وہ ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں۔ جس کی بنیاد ہوس، استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری اور اجتماعی خوشحالی ہو۔ فیض نے لینن پرائز ملنے پر ماسکو میں جو تقریر کی اس کے مندرجات میں اقبال کی فکر اور مطمع نظر (اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی) کو واضح طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اقتباس پیش خدمت ہے۔

"..... آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کینگیاں، خود غرضیاں، زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش! کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔ اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا کے خزانے انسانی بس میں آ سکتے ہیں۔ تو کیا انسانوں میں ذی شعور منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو، یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو۔ ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیر کائنات کو چلو جہاں کوئی تنگی نہیں ہے جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیائیں....."

دیکھیے فیض نے بھی اقبال کی طرح اس کائنات کو بے تیر و تفنگ مسخر کرنے کی خواہش کا اظہار تلقین کی صورت میں کیا ہے اور بین السطور میں اقبال کی یہ فکر (تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔۔ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے) بھی جھانکتی ہے۔ اس کا ادب کے زیرک قاری کے لیے فیض کے ملفوظات میں اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ نثر میں جس طرح ادیب اپنا نقطہ نظر اور مطمع نظر مربوط طریقے سے

بیان کرسکتا ہے شاعری میں نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے سطحی ناقدین نے شاعری کی اس بینی خصوصیت کو "اقبال کے ہاں تضاد" کا نام دیا ہے جبکہ بالغ النظر ناقدین نے اس تضاد کو اقبال کے فکری ارتقا قرار دے کر مطالعۂ اقبال کی راہیں روشن کی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے حکما و صلحا اور دانشوروں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو صرف اسلام کا نام لینے پر ہی مخاطب کو ناک بھوئیں چڑھا کر محدود سوچ کا طعنہ دینے لگتا ہے یہ طعن ودشنام اقبال کی طرح فیض کے حصے میں بھی آیا۔ جیسے فیض کو دو رکعتی اماموں نے مرتد اور لامذہب و لادین قرار دیا۔ اسی طرح نام نہاد ترقی پسند اور پروردگان مغرب نے اقبال کے بارے یہ کہا کہ اقبال کو تو اسلام کے باہر نظر ہی کچھ نہیں آتا مگر ان سب کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو اقبال کی نظم ونثر دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیوں ہوتی اور اقبال پر دنیا کی مختلف جامعات اور درسگاہوں اور تحقیقی اداروں میں تحقیقی کام کیوں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ہاں اسلام ہی آفاقیت کا علمبردار ہے چنانچہ وہ جب بھی اسلام کی بات کرتے ہیں تو وہ کائنات کی ہمہ گیر کشور کی بات کرتے ہیں ان کا مخاطب جو انسان ہے وہ اسے مرد خود آگاہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ خودی کا رازداں ہونے کے لیے تیار کرتے ہیں وہ اسے نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہونے کا درس دیتے ہیں۔ وہ اسے شاہین کی طرح آزاد اور خودمختار دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس کی نگہ بلند اور اس کا سخن دلنواز دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان تمام اوصاف حمیدہ کے نتیجے میں وہ اسے صادق، شجیع اور عدیل بنانا چاہتے ہیں تاکہ اس سے دنیا کی امامت کا کام لیا جا سکے۔ اسی دنیا میں ہر عقیدہ اور اعتقاد رکھنے والے مسلم وغیر مسلم شامل ہیں۔ ایسے امام سے وہ اسی اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی کا تقاضا کرتے ہیں جو فیض کے کلام اور ان کے وقتاً فوقتاً مضامین اور تقاریر سے ہویدا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلامی طرز فکر سے بیزار طبقے کی تشکیل وتنظیم میں بھی قصوروار وہی دو رکعتی امام ہیں اور وہ اسلام بھی انہی لوگوں کا ایجاب کردہ اور ایجاد کردہ ہے۔ دراصل اسلام میں اتنا اسلام ملا دیا گیا ہے کہ اصل اسلام کی شکل ہی گم ہو کر رہ گئی ہے۔ دراصل اسلام وہی ہے جس کے ہر قول سے، فکر سے اور اوامر و نواہی سے انسانی فلاح کی باس آتی ہے۔ فیض کی تقریر سے اسی انسانی فلاح کی باس ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کفر والحاد کے لیے کمینگی اور خودغرضی کا کنایہ استعمال کیا ہے بیشک کفر و الحاد ہی شخصی تسلط اور استبداد کا ذمہ دار ہے۔ وہ سوشل جسٹس اور مساوات کا دشمن ہے۔ اسلام شخصی تسلط کے بجائے الوہی تسلط کی بات کرتا ہے اور

مسلمان اس تسلط کے نتیجے میں مالک اور مقتدر اعلیٰ نہیں امین ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فیض کا کلام اور ان کی فکر فکرِ اقبال کی توسیع و تشریح ہے۔ جہاں تک فیض کے اشتراکیت پسند ہونے کا تعلق ہے۔ وہ غالب معنوں میں اشتراکیت نہیں بلکہ وہ سرمایہ دارانہ استحصال سے بیزاری ہے جس طرح اقبال کے ہاں مرمر کی سلیں علامت ہیں جدیدیت کی۔ جس نے انسانی ذہن کے ارتقا اور ارتفاع کو طبقاتی استحصال سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اقبال کی طرح فیض کی شاعری یا ان کی نثر جملہ مباحث کے بارے میں کوئی طرز فکر نہیں اختیار کرتی۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ وہ روحانی مسائل اور فلسفیانہ گتھیاں جو اقبال نے سلجھائیں فیض نے ان کو از سر نو چھیڑنے یا چبائے نوالے دوبارہ چبانے سے گریز کیا اور فکرِ اقبال سے اتفاق یا اختلاف کے بجائے عصر رواں کے مطابق فکر اقبال سے خوشہ چینی کی اور بات کو آگے بڑھایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال اور فیض میں کئی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ان کی پیدائش کا ضلع (سیالکوٹ) تعلیمی ادارے (مسجد مکتب، مرے کالج، گورنمنٹ کالج، پیشہ (تدریس) بین الاقوامی مقبولیت۔ عوام میں مقبولیت، فکری سطح پر انقلابی اور جدید سوچ اور روایت شکنی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پسے ہوئے عوام کے لیے درد دل دونوں عظیم شخصیات کا سانجھا ورثہ ہے۔ یہی باعث ہے کہ فیض کے ہاں انسان کے لیے وہی درد اور تڑپ پائی جاتی ہے جس نے اقبال کی راتوں کو سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی کی کشمکش میں مبتلا رکھا۔ اقبال کے کلام میں عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹنے اور دولت غرناطہ کی بربادی اور ہندوستانیوں کی غلامانہ حالت پر جو خون کے آنسو چھلکتے ہیں۔ فیض بھی عصرِ حاضر میں سسکتی انسانیت، فلسطین و کشمیر اور سقوط مشرقی پاکستان سے بے خبر اور لاتعلق نہیں۔ دونوں کا مطمع نظر ایک ہے، خواب ایک ہے۔ دونوں اس کے حصول کے لیے ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔ دونوں حصول مقصد کے لیے معاشی و سماجی عدل و انصاف اور مساوات کے قائل ہیں اور یہی اسلام ہے مگر اقبال کی طرح فیض اسلامی نشاۃ ثانیہ کے حصول کا عندیہ نہیں دیتے اور نہ ہی اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اقبال اور فیض دونوں کو اپنی زندگی ہی میں عالمی سطح پر اپنے وطن کی شناخت بننے کا افتخار اور اعزاز حاصل ہے۔ جس طرح اقبال کی شاعری بیسویں صدی سے نکل کر اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی ہے اسی طرح فیض کی شاعری بھی اس وقت تک زندہ و جاوید رہے گی جب تک حاکم و محکوم اور ظالم و مظلوم کا تقرر جاری رہے گا۔

☆☆☆☆☆

تین ہجرتوں کی داستاں، ایک داستاں گو کی زبانی

یہ کتاب ایک چھوٹا سا انسائیکلوپیڈیا ہے، عام آدمی کی خاص باتیں ہیں، وہ باتیں جو ماضی گزیدہ لوگوں کی یاد سے محو نہیں ہوتیں، ہم اس نسل کے گواہ جانے کیا نصیب لائے ہیں کہ ماضی میں سانسیں لیے بغیر ہم اپنی سانسوں کو رواں نہیں رکھ سکتے۔ نئی نسل اپنے ماضی سے یقیناً کچھ مختلف سلوک رکھے گی، ممکن ہے وہ ہم سے بھی زیادہ ماضی پرست ہو، یا جان چھڑا کر حال اور مستقبل کے زمانوں کو کافی سمجھے۔ بہرحال یہ خوبصورت کتاب رواں اور خوبصورت اسلوب میں ہمیں ماضی کی بھول بھلیوں کی سیر کراتی جدید دنیا میں لا چھوڑتی ہے، وہ دنیا جہاں ہم فطرت کے قریب تھے۔

یہ دنیا جہاں ہم فطرت کے مقابلے پر ہیں، جدید سائنسی ذہن ابھی ٹیکنالوجی کی آنکھیں چندھیا دینے والی کیفیت میں ہے آگے برقی زمانہ ہے ذرا وہ بھی انجوائے کر لے، اس دوران روٹھے موسموں اور غصے میں دکھتی فطرت نے کوئی کروٹ نہ لی تو اگلی نسل کچھ اور خلا میں سیر سپاٹا کر لے گی۔

بہرحال امتیاز گلیانوی صاحب کی یہ کتاب میرے بہت ہی عزیز دوست راجہ یونس صاحب نے گوجر خان سے پنڈی واپس آتے ہوئے، اپنی بہت سی محبتوں، چکوال کی خاص سوغات کے ایک تھیلے کے ساتھ عطا کی تھی، دوستوں کی محبت اور کتاب قیمتی تحفے ہیں، لیکن خاص سوغات کا ذائقہ بھی نہیں بھولا،

ایک بھرپور سماجی اور ہجرتی زندگی کی یہ داستاں نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہے، بہت سے گم سماجی حوالوں اور روایات کے ذکر نے کتاب کی اہمیت بڑھا دی ہے، گلیانوی صاحب کی دیگر کتابوں کی فہرست نے ان کے مطالعے تحقیق اور ذوق کی وسعت و فراوانی کا احساس دلایا ہے۔

اس خودنوشت لکھت اور اختصار کی کہانی بھی ان کی زود گوئی اور تصنیفی رجحان کا پتہ دیتی ہے، اپنی بات کو خودشناسی کا ایک قدم قرار دے کر خدا شناسی کی سمت بڑھنے کا احساس گلیانوی صاحب کے فکری ادراک کا ایک در یچہ ہے:

گھریلو زندگی ماں باپ کے لاڈ اور تربیت کے انداز گلی محلے سکول اور ہجولیوں کا ذکر

.....

اساتذہ کے ڈنڈے اپنی شرارتیں، دیہاتی زندگی کے رنگ بڑے شہروں کی طرف روانگی تعلیم

خیر زمان راشد

جاب مغرب کی تہذیبی بھول بھلیاں ملکی
سیاست مذہبی رجحانات سیاست و معاشیات
کے متوازی عرفان ذات کا زندہ و توانا
احساس۔۔۔اس سب کے ہوتے ہوئے سیلف
میڈ ہونے کا واہمہ کہاں جی پاتا۔۔

امتیاز گلیانوی صاحب خوب جان گئے کہ انسان
کو فطرت اپنے اور سماجی تعامل کے ساتھ تخلیق
کے چاک پہ گھماتی ہے اور آخری سانس تک
انسان ایسے ہی جیتا چلا جاتا ہے۔۔۔

آپ نے یہ کہہ کر ان سب لوگوں، ہستیوں
اور سنگ ہائے میل کا حق ادا کرنے اور اس
احساس کو پروان چڑھانے کی شعوری
کوشش کی ہے۔ کہ ہم جو کچھ ہوتے ہیں
اس میں خدا اور ارد گرد پھیلی کائنات کے
ساتھ اس کے بندے بھی حصہ دار ہوتے
ہیں۔ بندوں کی گنتی کریں تو شکریہ کے
لیے لفظ کم پڑ جاتے ہیں،

شکر کرنے والے اپنے ادراک میں ایسے ہی
ہوتے ہیں، یہ کتاب عام آدمی کی داستان ہے
اور خاص آدمی بنانے کا سلیقہ سکھاتی ہے،

آپ جرنل نہ بن سکے
شکر ہے ورنہ عام آدمی نہ ہوتے،
اور ایک اور عام آدمی آپ کا قاری نہ ہوتا۔۔

پروفیسر صاحب سے سونے کی چھلّن اور
انگوٹھی سمیت بھاگنے پہ الگ سے داد بنتی
ہے، ذرا سا غرور تھا لیکن آپ پالتے پوستے
تو بہت خطرہ تھا۔۔

عشقیہ کی ساحلی پٹی میں بھی کوئی کر توڑ عشق کی
واردات نہیں ملی۔۔ اپنے تارڑ صاحب کو تو ہر
سفر میں جپسیاں جپھی ڈالے رکھتی تھیں،

ہر عنوان کے ذیل میں ایک مکمل کہانی ہے،
تین ہجرتوں کی مناسبت سے ابواب یا کتاب
کے تین حصے کر دیئے جاتے تو آسانی ہوتی۔

اسفار مقدسہ و غیر مقدسہ کی اپنی اپنی جمالیات
ہیں، آپ نے خوبصورتی سے منظر حرف کے
پیکر میں سمو دیئے ہیں۔۔

جپسیوں اور ساحلوں پہ دھوپ کھاتی لڑکیوں
کے ذکر سے زیادہ دلچسپ ڈاکٹر انعام الحق
جاوید سے پوٹھوہاری زبان پہ گفتگو کے بعد کی
ماہیت قلب کی داستان ہے۔ ماں بولی اور مقامی
زبانوں کے حوالے سے ہم بہت بے حس ہیں۔
اور اگر کوئی سنجیدہ نقاد تنقید کر دے تو اسے بھی
دشمنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ پر اہل فکر ایسی تنقید
سے ،،سدراں نال سیک،، جیسے
ادب پارے تخلیق کرتے ہیں،

لکھنے والوں کی اپنے قارئین سے کچھ
بے تکلفی بھی روا ہے، مناسب سی تنقید
لازمی ہے، آپ تو اپنے قاری کو برابر مایوس
کرتے چلے جا رہے ہیں، دوسری ہجرت
کے پہلے پڑاؤ کے قیام میں بھی صرف مونا
لیزا کی اداس مسکراہٹ!!!

عشق پیشہ شعر پہ کوئی افتاد اتری ہے کہ
خوباں شہر بدر ہیں،

ہائے اپنے تارڑ صاحب۔۔۔
آپ سلامت رہیں

☆☆☆☆☆

نسیم سحر ایک فنکار

شاعری انسانی احساسات اور محسوسات کا عمدہ اظہار ہے۔ جب غالب یہ کہتا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

.....

تو پھر کسی بھی فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے فن کار کا مقام اعلیٰ وارفع ہو جاتا ہے اور شاعر کے ذہن میں آنے والے مضامین اُسے بہت سارے معاملات میں بری الذمہ بھی قرار دیتے ہیں۔ ن م راشد، مظفر وارثی، نوشی گیلانی، فرحت عباس، فہمیدہ ریاض کی شاعری بھی ناقدین کی عدالت سے سرخرو ہو کر باہر آ جاتی ہے۔ آرٹسٹ ہونے سے بھی پہلے ہم انسان ہیں مگر انسانی رویوں پر بہت کم لوگ پورا اُترتے ہیں۔ نسیم سحر انتہائی نفیس انسان ہیں۔ اُس کے بعد ظاہر ہے اُن کے بہت سے حوالے ہیں۔ گھنے درختوں، نہایت معتدل موسموں، باغوں اور باغیچوں کے شہر اسلام آباد میں بسنے والا فن کار بہت دھیمے لہجے میں بات کرتا ہے مگر لفظوں کی کاٹ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اس بے اعتمادی کی فضا میں شاعر کا لہجہ بہت مثبت اور پُر اعتماد نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں سراب میں بھی پیاس کے بجائے تری نظر آتی ہے۔ جناب نسیم سحر کا تخیل زرخیز ہے اور عام لوگوں سے ہٹ کر ہے جو اُن کے کلام کو منفرد اسلوب عطا کرتا ہے۔ میری ان سے پہلی ملاقات رائٹرز ہاؤس میں ہوئی۔ مگر میں اس ملاقات میں اندازہ نہ کر سکا کہ انتہائی پُرکشش شخصیت والے نسیم سحر کے کریڈٹ پر 17 کتابیں ہیں جو شاعری، خاکوں، نظموں اور ہائیکو پر

خالق آرزو

بنی ہیں۔ جناب نسیم سحر اندرون اور بیرونِ ملک مشاعروں میں شرکت کر کے سماجی اور ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے حساس دل سے نکلنے والے اشعار نہ صرف اہلِ دانش کے دلوں پر اثرانداز ہو رہے ہیں بلکہ ان کی گونج معاشرے میں بھی سنائی دے رہی ہے۔

ورڈزورتھ نے ایسی ہی فضا کے بارے میں کہا تھا کہ اس حالت میں دل کے بنیادی جذبات کو بہتر زمین میسر آتی ہے۔ جس سے وہ پختگی اور بلوغ کو پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں دباؤ کم ہوتا ہے اور وہ زیادہ صاف اور زیادہ پُرزور زبان میں اپنا اظہار کر سکتے ہیں کیوں کہ زندگی کی اس حالت میں ہمارے بنیادی احساسات زیادہ سادگی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ دیہی زندگی کے طور طریقے بنیادی طور پر احساسات کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اس لیے زیادہ آسانی سے سمجھے بھی جا سکتے ہیں اور زیادہ پائیدار بھی ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس حالت میں انسان کے جذبات قدرت کی حسین اور دائمی صورتوں سے پیوستہ ہوتے ہیں۔ نسیم سحر شہر کو ایک ایسے زندان سے تعبیر کرتے ہیں، جس میں روشنی کا گزر تو ہے مگر کثیف ہوا جس زدہ ہے اور ابر کے ایک ایک چھینٹے کو ترس رہی ہے۔ اُن کے بعض اشعار اس تناظر میں انسان کے سب سے بڑے دشمن یعنی "شہر" کے مختلف روپ ہیں۔ جہاں پیاسی دست درازیاں بھی ہیں اور معاشرتی چیرہ دستیاں بھی:

شہر کے شور میں کس کس کو سماعت کیجیے
یہی کافی ہے اگر کوئی صدا آ جائے!

.....

کذب پسند زمانے کے اطوار کچھ ایسے ہیں
کوئی سچی بات کرے تو گالی لگتی ہے

.....

نسیم سحر بنیادی طور پر غزل گو ہیں اور غزل کو اُردو شاعری کے ماتھے کا جھومر تصور کرتے ہیں۔ نہ صرف اس لیے کہ اُن کی شاعری میں ہماری تہذیب کی دھڑکنیں سنائی دے رہی ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ان سے ماضی کی سمتیں، ریاضت کرنے اور مستقبل کی رفتار پر ادب کا معیار متعین کرنے میں مدد ملتی ہے اُن کے تخلیقی رویے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نام نہاد ترقی پسندوں کی آہ و بکا پر کان دھرنے کے بجائے غزل کی جدت کو اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں نئے سے نئے دریچے کھلنے کے امکان روشن رہتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ کم تر معیار کے سخن وروں نے غزل کو بھی کم ظرف بنا دیا ہے۔ مگر کیا دوسری اصناف میں نہیں ہوا۔ یقیناً ہوا، لہٰذا قصور صنف کا تو نہ ہوا۔ اُس کے برتنے والوں کا ہوا۔ اصل میں، میں یہ کہنا

چاہتا ہوں کہ صنف چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی۔ کہنے والے چھوٹے یا بڑے ہوتے ہیں، اور بڑائی فن و تجربہ کے معیار، زندگی کے معاملات اور شاعر کی خوبیِ اظہار سے ہوتی ہے۔ نسیم سحر کے ہاں یہ خوبی اظہار ہر سطح پر موجود ہے اور اُن کے یہ شعر اُن کے جان دار فنی رویے کے شاہد ہیں:

وہ ختم قید کی میعاد بھی نہیں کرتا
مگر میں زحمتِ فریاد بھی نہیں کرتا

کرے وہ شاد، توقع کبھی نہیں رکھی
تو یہ کہ وہ مجھے ناشاد بھی نہیں کرتا

مہکتا رہتا ہے ہر دم جو میری سانسوں میں
وہ آدمی تو مجھے یاد بھی نہیں کرتا

.....

وہ جذبات کی حدت سے آرٹ کا کام لینا جانتا ہیں:

میرا کمال یہ ہے کہ اپنی شکست میں
میں نے شکست ذات کو شامل نہیں کیا

.....

پوری بات بتانا مشکل ہو شاید
پھر بھی کوئی اشارہ مجھ کو دے دیتا

.....

اوپر میں نے کہا ہے کہ نسیم سحر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور نظم پر ان کی گرفت یکساں نہ سہی لیکن وہ اس صنفِ سخن کو بھی کم عزیز نہیں رکھتے۔ نسیم سحر کی نظموں میں عصرِ حاضر اپنی مانوس علامتوں اور اس کی تاثیر معنی آفرینی کے ساتھ منکشف ہوتی ہے۔ نظم کے موضوعات ان کی غزل سے جدا اور منفرد ہیں۔ انھوں نے جدت کو اپنا مسلکہ نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں لفظوں سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ سوچ اور رویے کی تازگی ملتی ہے۔

نسیم سحر کی ہائیکو پڑھتے ہوئے شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ خیال کے ساتھ ہیئت کی آزادی کے بھی قائل ہیں۔ انھوں نے ہائیکو میں نہ صرف جاپانیوں کے بنیادی عناصر یعنی سورج، روشنی، درخت، پھول، موسم، رنگ، تازگی سے استفادہ کیا ہے بلکہ برصغیر کی شعری روایت سے آنسو، پیاس، ہجر، بے وفائی اور غم کو بھی ہائیکو میں سمویا ہے۔ اس طرح حیرت کے استعارے بھی اُن کے ہاں فراوانی سے ملتے ہیں:

آنکھوں میں ہر دم
ٹپ ٹپ روتا رہتا ہے
ساون کا موسم

ساون کے مہینے میں
اُبھری ہیں کتنی یادیں
جلتے ہوئے سینے میں

چھت پر اترا چاند

کمرے کے اندر اب بھی
روشنیاں ہیں ماند

پانی کی کٹوری ہے
وہ میرے تصور سے
کچھ بڑھ کے ہی گوری ہے

ستو ہی پلا دیتی
مہمان گیا تھا میں
نظریں تو ملا لیتی

پیار کے یہ سنجوگ
دامن میں بھر دیتے ہیں
کیسے کیسے روگ

....

نعت گو شاعروں میں یہ نازک ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نعت کے مضامین میں، جن کی تعداد ہزاروں میں ہے، نئے پن کی تلاش میں کوشاں رہیں۔ یاد رہے کہ نعت کے باب میں گزشتہ بہت سی دہائیوں سے جو کامیاب کوششیں ہوتی رہی ہیں، وہ اتنی فروٹ فل ہو چکی ہیں کہ اب نعت محض ایک موضوع نہیں رہا بلکہ یہ صنفِ فن کے بہت عظیم نمونے بھی پیش کر رہی ہے۔ یوں یہ اپنے فکر اور فنی خوبیوں کے ذریعے اردو اصنافِ سخن میں جداگانہ مقام و مرتبہ رکھتی ہے۔

جناب نسیمِ سحر نے محبت رسولؐ میں بھی اپنی محبت کا نہ صرف اظہار کیا ہے بلکہ رسالتؐ مآب کے ذکر میں ادب اور احترام کا سلیقہ بھی قائم رکھا ہے اور بحیثیت مجموعی اپنے طرزِ فکر اور روشِ اظہار کو تازہ رکھنے میں بھی کامیاب رہے ہیں:

لٹیں گی وہاں رحمتیں اس مہینے
رہوں کاش پورا مہینہ مدینے

دراصل ہوئی اس دن تعمیر مدینے کی
ہجرت نے سنواری جب تقدیر مدینے کی

ہو نہ جب تک لاشعوری اور شعوری حاضری
اپنی ہے تب تک مدینے میں ادھوری حاضری

فقط اک استعارہ ہے مدینہ
نبیؐ کے دم سے ہے پیارا مدینہ

نسیمِ سحر نے رسولؐ اللہ کی ذات پاک اور مدینہ کو انھی کے وجود و شعور اور لاشعور سے ہمکنار کر کے یوں دیکھا ہے کہ اس شہرِ محبت نے انھیں ایک تخلیقی واردات عطا کی، سو اُن کی چمک دار اور دل پذیر شعر اسی شہر سے متعلق ہو گئے ہیں:

روشنی میں نہائے ہوتے ہیں
ہم مدینے میں آئے ہوتے ہیں

ہے کوئی ساحلِ محفوظ تو مدینہ ہے
چہار سمت بھنور کے سوا کچھ اور نہیں

.....

میں کسی سمت گیا، کوئی بھی منزل تھی مری
لے گیا ہے مرا وجدان مدینے کی طرف

.....

آپ کی یاد کے جب پھول کھلے
روح تک خود کو معطر پایا

.....

شاعر کی روح یادِ نبیؐ سے معطر ہوگئی۔ اُسے اپنا شاعرانہ منصف یعنی ابلاغ اور بیان کا خیال آیا اور اُس نے اپنی سوسائٹی کو یوں مخاطب کیا:

نسیمِ یوں نہ رہو دربدر، مدینے چلو
بس اب نہ دیکھو ادھر یا اُدھر مدینے چلو
سیاہ راتوں کے جنگل میں مت بھٹکتے پھرو
ہر ایک شب کی وہاں ہے سحر، مدینے چلو
کسی طرف کا سفر ہو، اُدھر کا دھیان کرو
کسی طرف ہو غبارِ سفر، مدینے چلو
جمال و حسنِ بے انتہا کا دریا ہے
اور اس میں کوئی نہیں ہے بھنور، مدینے چلو
اب اور راستہ کوئی نہیں نسیم سحر
کچھ اب نہ سوچو نسیمِ سحر، مدینے چلو

.....

الغرض نسیم سحر کو، حمد، نعت، سلام، غزل، ہائیکو ہر صنف پر ملکہ حاصل ہے۔ میرے خیال میں وہ ایک چلتی پھرتی یونیورسٹی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے لوگوں سے استفادہ کریں۔ اللہ پاک اُنھیں سلامت رکھے۔

معروف شاعر جناب سعد اللہ شاہ نسیم سحر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نسیم سحر سے مجھے ایک شبنمی احساس، ایک لطیف مہک اور خوشگوار طراوت کا خیال آتا ہے۔ یہ سبک گام خیال مصحفی کے شعر کی طرح ہے کہ:

چلی بھی آجرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ بہار ٹھہرے گا

.....

ہمارے یہ شاعر خوش نوا بھی اور ہمہ جہت بھی ہیں۔ وہ ایک طرح دار شاعر ہیں۔ بات میں برجستگی، انداز میں وارفتگی، خیال میں نکتہ آفرینی ان کا خاصا ہے۔ وہ رکھ رکھاؤ نشست و برخاست اور میل ملاپ میں بھی شاعرانہ کمالِ عجز رکھتے ہیں۔ ان کے قصرِ شعر کی منڈیروں پر نعت کے نگینے بھی جڑے ہیں۔ نسیم سحر کو شعر کہنے کا طریقہ آتا ہے۔ وہ اسلام آباد کی سنگلاخ فضاؤں میں خیال کا بیج بوتے ہیں تو وہ پھوٹتا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع اور زبان کی چاشنی موجود ہے۔ ہنرکاری ایسی کہ جب وہ لفظ کو چھوتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں۔"

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے ملہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

جب یہ کارروائی ہو رہی تھی تو میں لندن میں تھا۔ درحقیقت مجھے اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ پاکستان میں کیا سیاسی کھچڑی پک رہی ہے۔ جب میں واپس آیا تو اصل صورت حال کا علم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی لاہور سے بلاوا آ گیا۔ فوراً پہنچو۔ لاہور میں سی ایم سیکرٹریٹ گیا تو حکم ملا کہ چھاؤنی کے پل کے نیچے کوئی راجہ صاحب ہیں ان کے مکان میں آپریشن انچارج بیٹھا ہے اس سے فوراً رابطہ قائم کرو۔ جب میں راجہ صاحب کے مکان پر پہنچا تو وہاں حضرت میاں شہباز شریف تھے۔ درحقیقت میری ان سے یہ پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ شکل بھی میاں نواز شریف سے ملتی تھی۔

رنگ بھی سرخ و سفید تھا۔ سر پر بال بھی خال خال تھے لیکن آنکھوں میں عجیب سی چمک اور لب و لہجہ بڑے بھائی کے برعکس خاصا تیز اور قدرے کھردرا تھا۔ منہ میں پائپ تھا لیکن اس میں تمباکو ڈالنا بھول گئے تھے یا پھر وہ کب کا بجھ چکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میرا آپریشن کب ہوا تھا، میں کس کربناک کیفیت سے گزرا ہوں۔ واپس کس تاریخ کو آیا ہوں۔ میرے بیٹھتے ہی بولے۔ ''ڈی سی آپ کے ممبر بھاگ گئے ہیں، انہیں واپس لائیں۔''

''وہ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

بولے ''صحیح علم تو نہیں لیکن سنا ہے کہ وہ سوات کے کسی ہوٹل میں رکھے گئے ہیں۔''

''میں وہاں پہنچوں گا کس طرح؟ اور پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ واپس آ جائیں گے یا سیکورٹی والے انہیں ہوٹل سے باہر نکلنے کی اجازت دیں گے۔''

کہنے لگے ''آپ انہیں فون کر کے بلائیں''

عرض کیا ''فون کی سب لائنیں میری اطلاع کے مطابق کٹ چکی ہیں''

بولے ''مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ وہ کیسے آتے ہیں۔ وہ آپ کے ضلع کے ممبر ہیں ان کو واپس لائیں۔'' میں سمجھ گیا کہ میاں صاحب اس وقت غصے میں ہیں اور ان کو میری بات کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہو رہا۔

''آپ نے انہیں بھاگنے ہی کیوں دیا ہے؟'' میں نے بال کو ان کے کورٹ میں ڈالنا چاہا۔

کہنے لگے ''ہمیں کیا علم تھا کہ یہ بے ضمیر لوگ فوراً بک جائیں گے۔ ان سب نے ہمیں اپنی وفاداری کا حلفیہ یقین دلایا تھا'' وہ کچھ دیر رُکے اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے ''میں نے سنا ہے کہ احمد عالم انور پر شیدانی شریف کے جمال کریجہ کا بڑا اثر ہے۔ اگر وہ اسے یقین دلا دے کہ اگلے الیکشن میں اس کے بالمقابل کھڑا نہیں ہوگا تو احمد عالم انور فوراً واپس آ جائے گا۔''

عرض کیا ''جمال کریجہ اپنی سیاسی اہمیت کھو چکا ہے۔ اگر اس میں دم خم ہوتا تو احمد عالم کا مقابلہ کرتا۔ بالفرض وہ احمد عالم کو یہ باور بھی کرائے تو کیا وہ مجذوب اس کی بات کا یقین کر لے گا۔''

زچ ہو کر بولے ''کچھ بھی ہو آپ انہیں واپس لائیں۔''

اب ان سے مزید بحث فضول تھی۔ زیادہ باتیں کرنے سے میرے سینے میں درد شروع ہو جاتا تھا۔ تازہ تازہ آپریشن ہوا تھا۔ سینے کی ہڈیاں جڑ تو گئی تھیں پھر بھی تڑتڑاتی رہتیں۔ ''اچھا کچھ کرتے ہیں'' کہہ کر میں واپس آ گیا۔

تین دن اسی بحث بحثی اور تگ و دو میں لگ گئے۔ سوات میں عملاً مقید ممبران تک پہنچنا کسی طور ممکن نہ تھا۔ جو غلطی میاں صاحبان نے انہیں کھلا چھوڑ کر کی تھی بے نظیر اس کو دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ پھر ان کا مسئلہ آسان تھا۔ ممبروں کو اسمبلی میں پیش تو کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کو حاضر کرنے کا بار تحریک لانے

والوں پر تھا۔ اس اثنا میں یوسف رضا سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگا۔
آخر عدم اعتماد کی تاریخ آ گئی۔ اسے ناکام ہونا ہی تھا، سو ہوگئی۔ اس وقت بھی میں میاں شہباز شریف کے پاس راجہ صاحب کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اب کے انہوں نے پائپ صحیح معنوں میں سلگا رکھا تھا۔ دھوئیں سے سارا کمرہ بھر گیا تھا۔ پسینہ ان کے ماتھے سے پھوٹتا اور ناک کے پھندنے پر آ کر تھوڑی دیر کے لئے اٹک جاتا اور پھر ٹپ سے میز پر گر جاتا۔ ''ڈی سی صاحب یہ کیا ہوگیا ہے۔ ڈی سی صاحب یہ کیسے ہوا ہے۔'' بار بار یہ لفظ ان کی زبان سے نکلتے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پریشانی نے مجسم شکل اختیار کر لی ہو۔ کافی دیر خاموشی رہی اور آخر میں میں نے ایک ایسی بات کہہ دی جو مجھے فوراً واپس ڈی بھی بنا سکتی تھی۔
میاں صاحب ایک بات کہوں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ اب کہنے کے لئے رہ ہی کیا گیا ہے۔ ان کے لبوں پر ایک سوگوار سی مسکراہٹ اُبھری۔

This may be blessing in disguise انہوں نے چرچل کی طرح یہ تو نہ کہا۔

Yes. At the moment it is quite effectively disguised

لیکن چونک کر میری طرف استفسار بھری نظروں سے دیکھا۔
''جھوٹی کے وزیر اعظم بننے کا آپ کو کیا فائدہ ہے؟'' پیر تسمہ پا کی طرح اس کے استخوانی ہاتھ پاؤں آپ کے گلے کا پھندا بن جائیں گے۔ اس صورت میں میاں صاحب شاید وزیر اعظم نہ بن پائیں۔ جس طرح کے حالات چل رہے ہیں یہ زیادہ دیر تک وزیر اعظم نہیں رہ سکے گی۔ میاں شہباز شریف نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میں ڈی سی نہیں کوئی ستارہ شناس ہوں جو اس قدر وثوق اور تیقن کے ساتھ پیشین گوئی کر رہا ہے۔
کہنے لگے ''ہم نے بڑی محنت کی تھی جو رائیگاں گئی ہے''
''کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ یہ محنت عنقریب ہی رنگ لائے گی۔''
ہماری میٹنگ ختم ہوگئی اور میں رحیم یار خان واپس آ گیا۔ وہاں آتے ہی میں نے دو کام کیے۔ رئیس شبیر کے والد نے تقسیم کے وقت ایک سکھ زمیندار کی بیس مربع زمین جعلی کاغذات پر بیعہ نامہ بنوا کر اپنے نام کرالی تھی جو بعد میں BOR نے منسوخ کر دی۔ اس نے حکم امتناعی لے رکھا تھا۔ وہ زمین میں نے بحق سرکار ضبط کر لی۔ یہ دوڑ کر اسلام آباد چلا گیا اور وہاں جا کر یہ جھوٹی خبر پھیلا دی کہ ڈی سی نے میری کھڑی فصل جلا دی ہے۔ اس کا اس نے ڈیڑھ کروڑ روپے معاوضہ وصول کیا۔ احمد عالم انور نے بھی بہنوں کی زمین ہتھیائی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے وہاں بھی بعض گھرانوں میں قرآن

کے ساتھ شادی کا رواج تھا۔ وہ میں نے واگزار کرا دی۔ اس نے بغیر لائسنس کے ڈیڑھ سو ہرن رکھے ہوئے تھے وہ بھی چھاپہ مار کر برآمد کر لئے۔ وہ بھی دوڑ کر اسلام آباد چلا گیا۔ اسے فوراً وزیر مملکت بنا دیا گیا تا کہ انتظامیہ اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔

وزیر اعلیٰ کے کہنے پر ہم نے لیاقت پور میں ایک بہت بڑا جلسہ کرایا جہاں میاں صاحب نے دل کھول کر ان دونوں پر لعنت ملامت کی۔ کہنے لگے "یہ دونوں پارٹی کے غدار ہیں۔ یہ رحیم یار خان کے میر جعفر و صادق ہیں۔ انہوں نے اپنے مینڈیٹ کی خلاف ورزی کی ہے اور ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔ ارے ان سے بہتر تو پیپلز پارٹی کا بھگوان داس ہے جس نے سندھ سے ہماری تحریک کا ساتھ دیا ہے۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

ایک دن احمد عالم انور کا پیغام آیا کہ وہ میاں نواز شریف سے اپنی غلطی کی معافی مانگنا چاہتا ہے۔ یہ پیغام اس کا دوست راجہ عبدالمجید لایا۔ میں نے میاں صاحب سے بات کی تو ہنس کر بولے۔ اس پاگل کا کیا اعتبار ہے پھر کھسک جائے گا۔ طے پایا کہ وہ بہاولپور سرکٹ ہاؤس میں مجھے ملے گا۔ وقت مقررہ پر وہ نہ آیا۔ راجہ مجید کی خفت دیدنی تھی۔ ہم کافی دیر انتظار کرنے کے بعد واپس رحیم یار خان کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب چنی گوٹھ کے اوور ہیڈ برج پر پہنچے تو سامنے سے اس کی جھنڈے والی کار آ رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا اور سوگز آگے جا کر کار روک لی۔ کچھ دیر ہم انتظار کرتے رہے کہ وہ کار سے نکل کر آئے گا اور تاخیر کی معذرت کرے گا۔ وہ نہ نکلا تو راجہ مجید اس کے پاس گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "وہ کہتا ہے کہ ڈی سی میرے پاس چل کر آئے، پراٹوکول کی رو سے اس کا آنا بنتا ہے۔"

میں نے کہا "To hell with him" اور کار اسٹارٹ کرا دی۔

اگلے دن وہ میرے گھر آ گیا اور معذرت کرنے لگا۔ میں نے کہا "احمد عالم انور آج تو تمہیں پراٹوکول یاد ہے۔ اس وقت پراٹوکول کدھر گیا تھا جب تم پسینے میں شرابور نصف شب کو پولیس سے بچتے بچاتے میرے گھر پہنچے تھے اور میں نے تمہیں گرفتار نہ کرنے کا حکم دیا تھا اور اس طرح حاجی سیف اللہ سے دائمی دشمنی مول لی تھی۔"

اس نے شرم سے سر جھکا لیا۔

کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر اُٹھتے اُٹھتے ایک بات کہہ گیا "کچھ پوچھوں؟"

"ضرور!"

بولا "اس ملک میں ارائیں ارائیں کی مدد کرتا ہے۔ جٹ جاٹ کا ساتھ دیتا ہے۔ راجپوت راجپوت پر جان چھڑکتا ہے۔ آپ نے سیّد ہو کر میری مدد نہیں کی۔ اُلٹا زمینوں سے بے دخل کر دیا۔"

''یہی سوال تم سے پوچھا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا ''تم نے سید ہو کر میری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔ نواز شریف کیا سوچتا ہوگا کہ سید اس قدر بدعہد اور وعدہ خلاف ہوتے ہیں۔ میں نے تمہیں ٹکٹ لے کر دیا۔ اگر پارٹی کا ساتھ نہیں دینا تھا تو حلف کیوں اُٹھایا تھا۔ استعفیٰ دے دیتے۔''

بن گیا رقیب جو تھا رازداں اپنا: ان کی دیکھا دیکھی میاں خالق نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ تحریک کے دنوں میں وہ بھی انگلینڈ میں تھا۔ اس کا بھائی بھی کراموبل میں زیر علاج تھا۔ اس بہتی گنگا میں تو بوجوہ ہاتھ نہ دھو سکا تھا، اب بھاگتے چور کی لنگوٹی سمیٹنا چاہتا تھا۔ اس نے بلیک میلنگ شروع کر دی۔ کچھ اس قسم کا تاثر دینے لگا۔ صبح گیا کہ شام گیا۔ ایک دن میرے پاس آیا اور گلہ کرتے ہوئے بولا۔ میاں نواز شریف نے دیگر ممبران کو رضوان گارڈن (ریواز گارڈن) میں پلاٹ دیے ہیں، مجھے نہیں دیا۔ فوراً لے کر دیں۔ کبھی کہتا کہ فوڈ ڈیپارٹمنٹ کو کہیں کہ میرے گودام منہ مانگے کرایے پر لے لے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ لڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس ہمہ ہمی میں اس کے بھائی ظفر نے بھی لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ شہر کی جتنی گرین بیلٹس تھیں اس نے ان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے خالق کو سمجھایا تو اُلٹا برس پڑا۔ کہنے لگا بے نظیر مجھے اس سے کئی گناہ زیادہ دینے کو تیار ہے۔ وہ تو میں ہی بدھو ہوں جو ابھی تک نواز شریف کے کیمپ میں کھڑا ہوں۔ میرے وجود میں غصے کی ایک شدید لہر اُٹھی۔ تو جاتے کیوں نہیں۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔ وہ پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

چند دن بعد مجھے شہباز شریف نے لاہور بلایا۔ کہنے لگے ''خالق آیا تھا۔ آپ کے خلاف شکایت لگانے۔ بات کرتے وقت آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ Give him a pat on the back'' جس قسم کی پشت وہ تھپتھپوانے کا عادی تھا وہ میرے بس میں نہ تھا۔ میں نے چوہدری منیر سے بات کی۔ منیر نے اسے اپنے دفتر بلایا۔ اس وقت اتفاقاً چوہدری غفور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ''خالق تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ ہر چوتھے روز لاہور آ کر رونا دھونا اچھی بات نہیں۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں شاہ صاحب نے ہمیشہ تمہاری پشت پناہی کی ہے۔''

اس پر وہ کہنے لگے ''انہوں نے کہا ہے کہ میں ارائیوں کا بی ماردوں گا (بیخ کنی کروں گا)۔'' اس قدر سفید جھوٹ اور وہ بھی میری موجودگی میں۔ وہ دراصل چوہدری منیر اور چوہدری غفور کو بھی مجھ سے بدظن کرنا چاہتا تھا کیونکہ ان کا تعلق بھی ارائیں برادری سے تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو ایک مرتبہ میرے سامنے ایوب مارتھ کے مظالم بیان کر کے رویا تھا۔ احسان فراموشی کو اس نے نئی معنویت بخشی تھی۔ چوہدری منیر اور غفور نے بھی اس کی سرزنش کی اور سمجھایا کہ اس قسم کی بے سروپا باتوں سے برادری کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔

چوہدری محمد منیر: پیکرِ مہر و وفا، ہیکل صدق وصفا، اخلاص اور مروت کی زندہ تصویر۔ عزم و ہمت کے بدر منیر، اس اعتبار سے چوہدری صاحب اسم با مسمّٰی ہیں۔ جب بھی رحیم یار خان کا ذکر ہوگا، جب کبھی بھی اس کی تعمیر و ترقی کے تذکرے ہوں گے تو ایک چہرہ جو پردہ ذہن پر ضرور اُبھرے گا وہ چوہدری منیر کا ہوگا۔ چوہدری منیر نے ترقی کے مدارج، زینہ بہ زینہ، مرحلہ بہ مرحلہ اپنی فراست، اخلاق اور بالغ نظری سے طے کیے ہیں۔ اس ملک میں امیر تو بہت ہیں لیکن مخیّر معدودے چند ہیں۔ بالفرض مالی قربانی دیتے بھی ہیں تو ہزار مصلحتوں کو شمار کرتے ہیں۔ تب ایک زخم جگر اختیار کرتے ہیں۔ کتنے ہیں جنہیں ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلے کی پروا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قدم دھرتی پر ہوتے ہیں اور نظریں آسمان پر گڑی ہوتی ہیں۔ خلیل جبران نے کہا تھا، ایک وہ ہیں جو دیتے ہیں اور دے کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ خوشی ان کا انعام ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو دیتے ہیں اور دے کر ملول ہوتے ہیں۔ یہ رنج ان کی سزا ہے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو حزن ملال اور مسرت و انبساط کے جذبوں سے ماورا ہوتے ہیں۔ ان کی مثال تپتے ہوئے صحرا میں اُس شجر سایہ دار کی ہے جس کی گہری اور گھنی چھاؤں تلے تھکے ہارے مسافر پل دو پل سستاتے ہیں۔ چوہدری منیر کا شمار بھی ان طیب لوگوں میں ہوتا ہے۔

ایک شام میں گھر میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ وزیر اعلیٰ کا فون آ گیا۔ میاں صاحب پوچھنے لگے تمہارا ADCG کیسا افسر ہے۔ میں اسے ڈی سی رحیم یار خان لگانا چاہتا ہوں۔ یوسف خان ریٹائر ہو رہا ہے I want to elevate you'' اب اگر میری عدم موجودگی میں احمد سعید نے سازش نہ کی ہوتی تو میں کہتا اچھا افسر ہے۔

''لیکن ایک اڑچن ہے''

''وہ کیا ہے؟'' انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''وہ یہ کہ احمد سعید حنیف رامے کا بھانجا ہے۔''

'' Oh! I see'' کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ یہ شخص میاں صاحب کے ہوتے ہوئے کبھی ڈی سی نہیں لگ سکے گا۔

جب میاں صاحب نے چیف سیکرٹری سے بات کی تو ایک بار پھر مخالفت کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ میں خاصا جونیئر ہوں۔ میاں صاحب بضد تھے کہ بہاول پور کی کمشنری کے لئے مجھ سے زیادہ موزوں اور کوئی افسر نہیں ہے۔ ایک دن چیف منسٹر کے دفتر سے فون آیا کہ میاں صاحب نے بلایا ہے۔

جنرل موسیٰ خان کے ساتھ ایک دن: ایک دن اطلاع آئی کہ گورنر بلوچستان جنرل موسیٰ اپنی فیملی کے ساتھ رحیم یار خان آ رہے ہیں۔ ان کے اے ڈی سی کا تعلق اس علاقے سے تھا اور اس کی شادی میں انہیں شرکت کرنا تھی۔ جنرل موسیٰ اس سے پہلے مغربی پاکستان کے گورنر بھی رہے۔ ان کا تقرر

نواب کالا باغ کی جگہ کیا گیا تھا۔ نواب کالا باغ ظالم اور سخت گیر تھا یہ طبعاً نرم دل اور نیک طینت انسان تھے۔ سپاہی سے پاک فوج کے کمانڈر انچیف بنے۔ ہمارہ معاشرہ ظلم کے خلاف تو آواز اُٹھاتا ہے لیکن ظالموں کو ہیرو بھی بنا دیتا ہے۔ اگر اقوام عالم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو تاریخ نے ہمیشہ ظالموں کو عظمت بخشی۔ اسی لئے سکندر رومی کو سکندر اعظم لکھا۔ چنگیز خان کے مظالم کی داستانیں کم رقم کیں اور اس کی فتوحات کا زیادہ ذکر کیا گیا۔ جذبہ جہانگیری بھی تو صریحاً ظلم ہے۔ بستیوں کو تاراج کرنا، خلق خدا کو تہہ تیغ کرنا، کشتوں کے پشتے لگانا اور کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرنا، کس قسم کی عظمت کی دلیلیں ہیں۔ موسیٰ خان کی شرافت کو کمزوری سمجھا گیا۔ لوگوں نے پھبتیاں کسنی شروع کر دیں۔ طرح طرح کے لطائف گھڑ لئے گئے۔ جن میں ایک یہ بھی تھا کہ پہلا کسی کی سنتا نہیں تھا دوسرا سمجھتا نہیں ہے۔ موسیٰ خان تک یہ باتیں پہنچیں تو انہوں نے بھی ''آنکھیں سرخ کرنے'' کا تہیہ کیا۔ پنجاب میں غنڈوں کو پکڑنے کا حکم صادر فرمایا۔ علی الصبح فون پر آئی جی سے ہلاناغہ پوچھتے۔ کتنا گنڈا پکڑا ہے؟ پولیس نے تنگ آ کر ہیرا منڈی کے دلالوں، بادامی باغ کے کوچوانوں اور کوچہ اہلی شاہ کے تلنگوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔

میں نے سیکورٹی کے لئے پولیس بھجوا دی اور خود بھی ان سے ملنے چلا گیا۔ ایک طویل عرصہ سے کچھ سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے اور مجھے ان کا جواب چاہئے تھا جو صرف جنرل صاحب ہی دے سکتے تھے۔ ان کے بچے تو شادی کی رسومات میں شمولیت کرنے چلے گئے اور میں جنرل صاحب کو اپنی کوٹھی پر لے آیا۔ وہاں کافی دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے حیرانی اس وقت ہوئی جب انہوں نے ہر سوال کا مفصل، مدلل اور پرمغز جواب دیا۔ میں نے پوچھا ''آپ نے سپاہی سے لے کر سی این سی بننے تک کا ایک طویل سفر کیا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہوا؟''

ماضی میں جھانکتے ہوئے بتانے لگے ''واقعی یہ لمبا اور پرآشوب سفر تھا۔ جب میں بھرتی ہوا تو اس وقت ہندوستان پر انگریز کا مکمل کنٹرول تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی ملک چھوڑ جائیں گے۔ دراصل دوسری جنگ عظیم نے نہ صرف اُن کی عسکری طاقت کی چولیں ہلا دیں تھیں بلکہ اُن کی سوچ کو بھی بدل ڈالا تھا۔ وہ جنگ جیت کر بھی ہار گئے تھے۔ وہ سورج جو برٹش ایمپائر پر کبھی غروب نہ ہوتا تھا بڑی تیزی کے ساتھ زوال پذیر تھا۔ میرا تعلق ہزارہ قبیلہ سے ہے۔ خاندان کی مشکل سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ جو شخص ایک غیر ملکی طاقت کے لئے بطور سپاہی جنگ کا ایندھن بننے کے لئے تیار ہو جائے اس کی مالی حالت اور خاندانی حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے قبیلے کو اچھی نظروں سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ ہم لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے کوئٹہ آئے تھے۔''

وہ ایک لمحے کے لئے رُکے اور پانی کے چند

گھونٹ پیتے ہوئے بولے "جنگ کس قدر خوں آشام تھی۔ اس کا اندازہ آپ لوگ نہیں کر سکتے۔ سمندر، چار سو بارود کی بو، کانوں میں زہر گھولتی ہوئی زخمیوں کی آہ و بکا، میدانوں اور جنگلوں میں بکھری ہوئی بے گور و کفن لاشیں جن کے گرد کوے، گدھ اور حشرات الارض منڈلاتے رہتے۔ نفسانفسی کا عالم، جنگ میں صرف سچائی ہی نہیں مرتی، اخلاق، تہذیب اور اعلیٰ انسانی اقدار بھی دم توڑ دیتی ہیں۔

میں نے کسی طور بچنا تھا، بچ گیا۔ پاکستان نے معرضِ وجود میں آنا تھا سو آ گیا۔ قوم اپنے قائد کے پیچھے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی۔ قائد کے عزم میں کوہساروں کی سی صلابت تھی۔

ملک تو بن گیا لیکن اس سے پہلے رقصِ ابلیس بھی ہوا۔ جب قائداعظم لاہور آئے تو انہوں نے والٹن مہاجر کیمپ دیکھنا چاہا۔ ہم نے مقدور بھر کوشش کی کہ وہ نہ جائیں لیکن وہ بضد رہے۔ چنانچہ انہیں لے کر جب کیمپ پہنچے تو کہرام مچ گیا۔ قیامت صغریٰ کا سماں تھا۔ لٹی پٹی بے خانماں عورتیں، کسی کی عصمت دری کی گئی تھی، کسی کا پستان کاٹ دیا گیا تھا، چھوٹے چھوٹے بلکتے ہوئے معصوم بچے جو اپنے والدین کی شفقت سے محروم ہو گئے تھے، بوڑھے ضعیف لوگ جن کی اولاد کے لٹ جانے کے غم میں کمریں کمان بن گئی تھیں۔ درد اور آہ و بکا کی لہریں تھیں جو موج در موج اُٹھ رہی تھیں۔ قائداعظم سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ خشک حلق سے صرف ایک ہی لفظ نکلا "Was it worth it?"

جنرل موسیٰ کی آنکھیں بھر آئیں "شاہ صاحب! قائداعظم نے رحلت تو ۱۹۴۸ میں فرمائی لیکن حقیقت یہ ہے والٹن کیمپ کی اس زرد دوپہر میں ہمارا محسن چل بسا تھا' کافی دیر خاموشی رہی۔ ٹرے میں رکھی ہوئی چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ وہی موسیٰ خان تھا جس کو نااہلی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔ وہ تاریخ کے ورق اُلٹ رہا تھا۔ چند تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈال رہا تھا جو ہماری نظروں سے پوشیدہ رہے۔

"اس کے باوجود آپ نے ہندوستان کے ساتھ ۶۵ء کی جنگ لڑی۔ حالانکہ آپ عسکری طور پر تیار نہ تھے۔ کیا یہ اس نفرت کا شاخسانہ تھا؟" میں نے انہیں اس کرب انگیز کیفیت سے نکالنے کی شعوری کوشش کی۔

"اس صورت میں فورسز کا مورال ڈاؤن ہو جاتا۔ ویسے بنیادی طور پر ایک جرنیل بھی سپاہی ہی ہوتا ہے۔ جب لڑنے کا حکم ملا تو ہم نے بندوق اُٹھالی۔"

عرض کیا "جنگ کا ایک بنیادی اصول ہوتا ہے۔ جو شروع کرتا ہے وہ اگر مقاصد حاصل نہ کر سکے تو یہ ایک طرح کی ہزیمت شمار ہوتی ہے اور مدافعت کرنے والا اسے اپنی نفسیاتی برتری گردانتا ہے۔ اس تناظر میں آپ معاہدہ تاشقند کو کیسے دیکھیں گے؟"

کہنے لگے "معروضی حالات میں وہ مناسب معاہدہ تھا۔ ہمارے پاس ہتھیاروں کی کمی پڑ گئی تھی۔ چونکہ ہماری ایئر فورس کو دشمن پر برتری

حاصل تھی اس لئے وہ بھی اسے طول نہ دینا چاہتا تھا۔ امریکہ نے مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسری سوپر پاور نے بھی ہمیں آنکھیں دکھانی شروع کر دیں۔ ایک طویل عرصے سے ہندوستان روس کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔"

"لیکن بھٹو نے واپس آ کر بڑا شور مچایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ مناسب وقت پر تاشقند کی بلی تھیلے سے باہر نکالے گا۔"

ایک زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ بولے "ہم بڑی جذباتی قوم ہیں۔ جس نے جنگ شروع کرائی تھی وہ ہیرو بن گیا۔ It is a freck of history"

"وہ راز افشا کیوں نہیں کیا؟ سیدھی سی بات ہے۔ ایک آٹھ کروڑ کی آبادی والا ملک اپنے سے پانچ گنا بڑے ملک سے ٹکرا گیا تھا۔ ایوب اور بھٹو کے اختلافات تاشقند میں ہی پیدا ہو گئے تھے۔ کسی بات پر ناراض ہو کر ایوب خان نے بھٹو کو برا بھلا کہا تھا۔"

جب وہ رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا "جنرل صاحب! آج آپ سے ملاقات بڑی مفید رہی ہے۔ مجھے یہ سب باتیں کسی نہ کسی مرحلے پر لکھنی بھی ہیں۔ صرف اتنا بتا دیں آپ مغربی پاکستان کے گورنر رہے جو ان دنوں انتظامیہ کا سربراہ اور کلی اختیارات کا مالک تھا۔ اب آپ ایک چھوٹے سے صوبے کے بے اختیار گورنر ہیں۔ جب آپ کو پیشکش ہوئی تو آپ نے سوچا تو ضرور ہوگا؟"

"بالکل نہیں" وہ بغیر کسی توقف کے بولے:

"Nice food, good accomodation, lot of comforts, look at my age, what else an old man requires?"

جنرل صاحب نے شاید درست ہی کہا تھا۔ وطن عزیز میں بوڑھے چھوڑ جوان حکمرانوں کو بھی اسی قسم کے لوازمات چاہئیں۔ صدر دورہ کر کے آئے تو وزیر اعظم کا گھوڑا تیار ہوتا ہے۔ جب وہ ہوٹے لے کر لوٹتا ہے تو صدارتی سواری پھر سے تیار ہوتی ہے۔ قائم مقام صدران چند دنوں میں پھرکی کی طرح پھرتا رہتا ہے۔ کبھی سالم جہاز لے کر اپنے گاؤں جاتا ہے تو کبھی دوست احباب کو کراچی، لاہور کی سیر کراتا ہے۔ فاروق لغاری بیٹے کی گریجوایشن تقریب کے لئے سالم جہاز لے کر نیویارک چلے گئے حالانکہ وہ ایک پرائیویٹ فنکشن تھا۔ وہاں سے شکار کرنے کا خیال آیا تو چھ گھنٹے مزید پرواز کے سان فرانسسکو جا پہنچے۔ Massy سٹور کا ایک حصہ ان کے خاندان کی شاپنگ کے لئے خالی کرایا گیا۔ صدر پرویز مشرف اور شوکت عزیز میں تو شرط لگی ہوئی تھی کہ اپنے دور میں کون زیادہ دورے کرتا ہے، آخری دنوں میں تو شاہ صاحب نے حد ہی کر دی۔ فرانس کا جھوٹا سچا دورہ بنا کر یورپ گئے۔ وہاں اپنے دیرینہ دوست برگیڈیر نیاز سے برج کھیلنے کا خیال آیا جو ان دنوں لندن میں مقیم تھا۔ چنانچہ تاش کا رسیا صدر لندن پہنچا۔ سرکاری خرچ پر ڈارچسٹر ہوٹل میں ٹھہرا جس کا کرایہ ساڑھے سترہ ہزار پونڈ (تیس لاکھ روپے) یومیہ تھا۔

[جاری ہے۔]

فرحت عباس شاہ [تمغہ برائے حسنِ کارکردگی]

..... گفتگو .....

فرحت عباس شاہ، منصور آفاق
عمران منظور، نعمان منظور

2022 کا اعزاز حاصل کرنے والے اردو کے ممتاز مشہور محترم اور عوامی پزیرائی حاصل کرنے والے شاعر فرحت عباس شاہ کا شمار غزل، نظم، آزاد غزل اور تنقید ہر شعبے کی نظریہ ساز شخصیات میں ہوتا ہے۔ فرحت عباس شاہ نے بہت زیادہ لکھا اور بہت معیاری لکھا اور ہر سطح کے قارئین سے داد و تحسین وصول کی۔ ماہنامہ بیاض، کے لیے فرحت عباس شاہ سے کیا جانے والا خصوصی انٹرویو پیش خدمت ہے۔

سوال: آپ گزشتہ 44 سالوں سے میدان ادب میں سرگرم ہیں۔ آپ نے گزشتہ چار دہائیوں میں وقت کے سرد و گرم کو نہ صرف دیکھا بلکہ بسر بھی کیا اس طویل عرصے میں ادبی فضا اور تخلیقی معیار کے تغیر و تبدل کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

☆.....☆ آج پہلے جیسا تحقیق اور تنقید کا معیار نہیں رہا۔ علمی خلوص کے ساتھ کام کرنے والے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ ناول افسانے سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ محققین اور ناقدین اداس نسلیں اور آگ کا دریا سے ایک قدم آگے نہیں نکل سکے حالانکہ پچھلے تیس سالوں میں بہت اعلیٰ ناول لکھے گئے۔ اگر موجودہ ناول کو ہی ملحوظ خاطر رکھا جائے تو لاہور سے میرے علاوہ منصور آفاق، کامریڈ ریاض احمد، کرنل اسد محمود، آزاد مہدی، خیبر پختونخوا سے سراظہار اللہ اظہار اور نوجوان لکھاری غنی خان نے ناول کی صنف کو بہت اعتبار بخشا ہے۔ نظم میں پروفیسر اسلم طارق، اعجاز رضوی، شفیق احمد خان، مظہر حسین اختر اور امیر جعفری بہت اعلیٰ پائے کی نظمیں لکھ رہے ہیں اور یہ لوگ بھی گزشتہ تین دہائیوں سے جدید اردو نظم کی آبیاری کر رہے ہیں۔ غزل کے میدان میں بھی بہت معتبر نام ہیں جن میں اختر عثمان، ممتاز اطہر، شفیق احمد خان، عابد حسین عابد، ڈاکٹر شاہد اشرف، راغب تحسین، ڈاکٹر خالدہ انور، سراظہار اللہ اظہار، احتشام حسن، شہزاد

واثق اور بہت سے شاعر ہیں جو نہایت ہی معیاری اور عمدہ غزل لکھ رہے ہیں۔ دوسری طرف مشاعروں اور سوشل میڈیا کے کئی شعرا بھی قدرے بہتر ہیں مگر ایک جیسی غزل سے باہر نہیں نکل پا رہے۔ دراصل صحیح معنوں میں کسی شاعر کے بارے میں اس وقت تک رائے مضبوط نہیں بن نہیں پاتی جب تک اس کی دو تین کتابیں شائع نہ ہو جائیں یا لکھتے ہوئے دس بیس سال کا سفر سامنے نہ آجائے لیکن اعلیٰ تخلیق کار کے حوالے سے یہ رویہ بھی درست نہیں کہ اعلیٰ تخلیقی کام دیکھ کر بھی تخلیق کار کے بوڑھا ہو جانے یا وفات پا جانے سے پہلے تک اس کے مرتبے کا اعتراف نہ کیا جائے۔ البتہ ایک اور پہلو بھی سامنے آیا ہے کہ مصنوعی تخلیق کاروں میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ تو میرے ہمعصر بھی ابھی تک مصر ہیں کہ ان کو جینوئن شاعر یا ادیب تسلیم کر لیا جائے۔ اب اس وقت لمحہ موجود کے مسائل بھی آن پڑے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔ سینکڑوں نئے لڑکے جو ویڈیو بنانے اور مشاعرے پڑھنے کے لیے دیوانوں کی طرح دوڑے پھرتے ہیں۔ ان بے چاروں کو پتہ ہی نہیں کہ جانا کہاں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ غزل کے شاعر تو ویسے بھی کتابیں پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں یا بہت تیر مار بھی لیں گے تو ایک دو کلاسیکی شاعروں کی جگالی کرتے رہیں گے۔ یہ پرانے شاعر بھی نئے لڑکوں کی رہنمائی کے قابل نہیں اور نئے لڑکوں کو تو پتہ ہی نہیں کہ شاعری کے لیے دل اور دماغ دونوں کی ریاضت کتنی اہم اور ضروری ہوتی ہے۔ نہ ان کو کوئی بتانے والا ہے۔ یہ ہم مزاج لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، محفلیں رنگین بناتے ہیں اور سرسری اور جعلی گفتگو کر کے سمجھتے ہیں کہ بہت گہری باتیں کی ہیں اور پھر ٹائیں ٹائیں فش۔

سوال: ادبی اداروں کے بارے میں کیا کہیں گے۔ کیا وہ کچھ اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔؟

☆.....☆ پاکستان کا سب سے بڑا ادارہ اکادمی ادبیاتِ پاکستان ہے۔ اس کا معمار ادب والی تصانیف ایک اچھا سلسلہ ہے لیکن پچھلے دنوں وہاں سے ناول پر جو کام ہوا ہے اتنا غیر معیاری تھا کہ دیکھ کر میری روح تک لرز اٹھی۔ دراصل مجھے لگتا ہے اس میں کچھ ایسے پراسرار لوگ بیٹھے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ شاعر ادیب وہی عظیم ہے جس کی اوپر سے کوئی سفارش آجائے یا خود چل کر آئے اور ان کی قدم بوسی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی باوقار ادیب وہاں جانا پسند نہیں کرتا۔ ان کا چیئرمین یا ڈی جی جو بھی ہے کبھی لاہور آجائے تو مصنوعی شاعرات اور شعرا کے غول کے غول پہنچتے ہیں کوئی عشائیے کی گزارش کرتا ہے کوئی ظہرانے کی استدعا لے کر پہنچتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ میرا شمار گزشتہ تینتیس برس سے مقبول ترین شعرا میں ہوتا ہے اور میرا تخلیقی کام اور اس کا معیار دنیا کے ادب کی تاریخ میں ایک مثال

ہے اور اس سال صدارتی ایوارڈ بھی ملا ہے لیکن ادیبوں سے متعلق یہ ادارہ مجھے جانتا تک نہیں۔ اسلام آباد والے ان سے تعلقات استوار رکھتے ہیں اور دور رہنے والوں کی ان تک رسائی مشکل ہوتی ہے۔ البتہ مجلس ترقی ادب اکیڈمی سے آگے نکل گیا ہے۔ جب سے منصور آفاق نے اس کا چارج سنبھال ہے اور پھر ہمارے پنجاب دوست وزیر اعلیٰ نے ان کو بنا کے ایک غیر ادیب کو اہم ادیبوں کی تضحیک کرتے ہوئے مجلس پر مسلط کیا۔ منصور آفاق نے وہاں آ کر جو کام کیے وہ کبھی بھی نہیں ہوئے۔ لائبریری، ادبی چائے خانہ، سٹاف کی نئی بلڈنگ اور نشر و اشاعت مجلس کے لیے باعث فخر ہے۔ منصور آفاق نے ایک مردہ گھوڑے میں جان ڈال دی تھی۔ اسی طرح بزم اقبال لاہور کو بھی نئی زندگی ملی ہے۔ باقی بک فاؤنڈیشن جیسے ادارے تو صرف پسندیدہ لوگوں کو کرسیوں پر بٹھا کے تنخواہیں دینے کے لیے ہیں۔

سوال: آپ کے کام کو خصوصاً نظم کے میدان میں کیے گئے کام کو بقول ڈاکٹر انیس ناگی اور جاوید شاہین عالمی ادب کے تناظر میں رکھ کے دیکھنا چاہیے لیکن اگر پچھلے بیس سالوں میں دیکھا جائے تو آپ کو ناقدین کی طرف سے بہت نظر انداز کیا گیا۔ آپ کے نزدیک اس کی کیا وجوہات ہیں؟

☆.....☆ جب میں یہ کام کر رہا تھا اس وقت نئی شاعری اور بڑی شاعری کی آرزو اور جستجو رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ ادب میں نظریاتی سطح پر کام ہو رہا تھا بڑے ادب اور بڑی تنقید کی گونج سنائی دیتی تھی۔ تعمیری مباحث کا کلچر تھا اس وقت کے اکابرین کی طرف سے مجھے بہت پذیرائی ملی لیکن پچھلی دو دہائیوں میں جیسے جیسے وہ بڑے لوگ اس دنیا سے گئے ان کی جگہ کم اہلیت کے حامل غیر سنجیدہ اور خود غرض لوگ ادیب اور ناقدین بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے میں چاروں طرف سے خوفزدہ لوگوں میں گھرا ہوا ہوں۔ یہ خوفزدہ لوگ میرے اور میرے جیسے ہر تخلیقی آدمی سے گھبرائے رہتے ہیں اور کمزور لوگوں کے بڑے بڑے بت بنا کر حقیقی بڑے لوگوں سے اونچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں آج تنقید اور تحقیق کا بیڑا غرق ہو کر رہ گیا ہے۔ خاص طور پر درسی تنقید اور تحقیق کا معیار اتنا پست ہو چکا ہے کہ اس سے کسی سنجیدہ یا بڑے کام کی طرف متوجہ ہونے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ آج آپ مجھے کسی ایک نقاد کا نام بتا دیں جو درسی مفادات سے نکل کر کام کرتا نظر آئے۔ لیکن یہ سب عارضی ہے۔ میرے کام کو کچھ وقت کے لیے نظر انداز تو کیا جا سکتا ہے لیکن رد نہیں کیا جا سکتا اور اب تو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ نظر انداز کرنے والے تاریخ کی گرفت میں آ گئے ہیں کیونکہ ان کی نشاندہی ہو چکی ہے۔

مجھے تو چھوڑیں (مرحوم) خالد احمد جیسے عالم شاعر اور ممتاز نظم کہنے والے کو یوں نظر انداز کیا گیا ہے جیسے ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کی شاعری بھی چلی گئی ہے۔ کیا یہ اردو زبان اور ادب کے ساتھ ظلم نہیں کہ اس طرح کے عظیم شعرا کو نظر انداز کر دیا جائے۔

سوال: آپ کا اشارہ کس طرف ہے کچھ بتانا چاہیں گے؟

☆.....☆ پچھلے تیس پینتیس برسوں سے تو میں خود ذاتی طور پر دیکھ رہا ہوں اور اس سے پہلے کی تاریخ منیر نیازی اور انیس ناگی کی زبان سے سُن چکا ہوں۔ ہمارے ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے کا شعبہ اردو ہمارے ادب کو جتنا نقصان پہنچا چکا ہے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس ادارے میں پڑھنے والے معصوم اور مخلص طلبا و طالبات کے ذہنوں کو کشادگی بخشنے کے بجائے متعصب بنا کے نکالا جاتا ہے پھر وہ جہاں جہاں جا کے پڑھاتے ہیں اس تعصب کا زہر اپنے شاگردوں میں سال بہ سال اور نسل بہ نسل بھرتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ شاعروں کو عظیم بنا کر پیش کیا جاتا رہا جو عظیم نہیں تھے اور کچھ کو ردی بنا دیا گیا جو عظیم تھے۔ میں ایک بار پھر دہراؤں گا کہ منیر نیازی، اختر حسین جعفری اور خالد احمد جیسے شعرا کو نظر انداز کیا گیا اور میرا جی جیسے فیک شعرا کو عظیم اور باقی بنا کے ہمارے بچوں کے ذہنوں میں اتارا گیا۔ میں نے ایسے بدنصیب مدرسین بھی دیکھے ہیں جن کے ذہن و دل آخری عمر تک اس عارضے سے نکل نہیں پائے نہ رب تعالیٰ نے ان کو احساس ہونے دیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کی آنکھوں اور کانوں پر مہریں لگا دی گئی ہیں۔ انھوں نے ہمارے تخلیقی بچوں کو مفلوج بنایا ہے اور ان کو ابھی تک اس بات کا احساس نہیں کہ استاد ہوتے ہوئے انہوں نے ہماری نسلوں پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔

سوال: آپ نے لگ بھگ دو سال پہلے نقاد کی موت کا اعلان کیا جس پر حلقہ ارباب ذوق کی انتظامیہ نے مباحثے کا اہتمام کیا جو بعد میں ماہنامہ بیاض کے جون 2022 کے شمارے میں شائع بھی ہوا، ہم دیکھتے ہیں کہ اس پر کسی قسم کا ردعمل سامنے نہیں آیا اس کے اسباب پر کچھ روشنی ڈالیے۔

☆.....☆ مردے ردعمل کیسے دے سکتے ہیں ہاں اگر ان کی روحیں اگر نیک ہوتی تو شاید کچھ اشارے ہمیں غیب سے آتے یہ بے چارے تو زندہ ہوتے ہوئے بھی بے روح لوگ تھے جو یا تو اپنی درسی کتب نصاب میں شامل کرنے اور بیچنے کے لیے تنقید لکھ رہے تھے یا نوکریوں کے حصول کے لیے۔ پچھلے دنوں کسی نے بتایا کہ اس نے ماحولیاتی تنقید پر کتاب لکھی ہے تو سن کر بے اختیار منہ سے لاحول نکل گیا۔ اب ایسی کتابیں لکھنے کا مقصد صرف کانفرنسوں کی ضرورت بننے

سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے۔ اسی ایک بات سے آپ ان لوگوں کے مائنڈ سیٹ کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس طرح یہ کسی چوکس شکرے کی طرح مفادات پر نظریں گاڑ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے ہاتھ سے شکار نکل نہ جائے۔ یہی حال ایک ساختیاتی نقاد کا بھی ہے جو جہاں جاتا ہے سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ کونسا فائدہ کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میری نظر میں یہ سارے مردہ ہیں اور مردے ردعمل نہیں دیا کرتے۔ آپ پچھلے تیس سالوں کے صرف غزل پر کیے جانے والے جائزے اور تحقیقی مقالے اٹھا کے دیکھ لیں ان میں نہایت معمولی شعرا کا ذکر تو ملے گا آپ کو لیکن فرحت عباس شاہ، عدیم ہاشمی، خالد احمد، نجیب احمد، رام ریاض، شفیق احمد خان، ممتاز اطہر اور اختر شمار کا کہیں ذکر نہیں ملے گا۔ نظم اور نثر میں بھی یہی حال ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ان کی علمی اور ادبی تحقیقی بدیانتی کو بے نقاب کیا جائے۔

سوال: آپ کے مزاج کا حصہ رہا ہے کہ آپ جس ذمہ داری کے نہ پورا کیے جانے کی نشاندہی کرتے ہیں اپنی ذات کی حد تک اس ضمن میں فرض ادا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ آپ نے ایک نئے اردو تنقیدی دبستان، ''ادراکی تنقید'' کی داغ بیل ڈالی ہے اس کے بارے کچھ بتائیے۔ یعنی ادراکی تنقید کیا کیوں اور کیسے؟

☆.....☆ دراصل ادراکی تنقیدی دبستان کے معرض وجود میں آنے کے پیچھے کئی وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ پچھلی تین دہائیوں سے ناقدین نے خود کو مغربی ادب کی جدید تھیوریوں کے علم کا رعب ڈالنے کے لیے ان کے مضمرات جانے بغیر اور ان کی پرکھ پرچول کیے بغیر اردو ادب کے سر پر زبردستی لادنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں ادب کے طالب علم واضح تفہیم پانے کے بجائے کنفیوز ہوتے جارہے ہیں۔ چونکہ یہ تھیوریاں ہمارے ادب کی تفہیم کے قابل ہی نہیں بلکہ ان کے نفاذ کا مقصد تخلیقی ادب کی روح کو قتل کرنا ہے اس لیے اب ایک دفاعی پوزیشن لینا ضروری ہوگیا تھا کہ تخلیق اور تخلیق کار کی روح کو قتل ہونے سے بچایا جائے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ تنقید کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ارتعاش پیدا کیا جائے تاکہ اس سے اٹھنے والی باس سے ادب کا دم گھٹ کر نہ رہ جائے۔ تنقید کا جمود توڑنا اس وقت عہد حاضر کے ادب کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جہاں تک اس کے کیا ہونے کے سوال کا جواب ہے تو وہ بہت سادہ ہے۔ اردو کی فطری طور پر پروان چڑھنے والی تنقید دراصل ادراکی تنقید ہی ہے جسے پس پشت ڈالا جارہا تھا۔ عسکری صاحب اور احتشام حسین سے لیکر انیس ناگی تک سب لوگوں نے ادراکی تنقید ہی لکھی ہے میں نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ اسے ایک باقاعدہ ڈسپلن کی شکل دی ہے اور تخلیق کار کے نظام تخلیق تک رسائی اور تخلیقی

عمل کی کلید دریافت کر کے تفہیم اور پرکھ کرنے پہ زور دیا ہے۔ ادرا کی تنقید کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ یہ تخلیق پاروں کو سمجھنے کے لیے قاری، ناظر یا سامع کے ادراک کو بھی شامل کرتی ہے اور نقاد کو قاری کی اور خود اس کی اپنی انفرادی حیثیت کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے تا کہ وہ لطف سے محروم نہ ہو اور علم سے نابلد نہ رہ جائے۔ میں نے اپنی اس کتاب میں پہلے سے وضع کیے گئے کچھ ضابطوں اور نظریوں کا استرداد بھی پیش کیا ہے اور استدلال بھی۔ امید ہے بہت سے بت ٹوٹیں گے۔

سوال: آپ ہمیشہ ادبی فضا کی آلودگی کی بات کرتے ہیں اس کی نوعیت، محرکات اور نتائج پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

☆.....☆ زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب کے شعبے میں بھی کچھ لوگ وائرس کی طرح سرائیت کر جاتے ہیں۔ یہ وائرس بظاہر شاعر اور ادیب کا ہو بہو حلیہ بنا کر ادب کے مدافعتی نظام کو دھوکہ دے کر اندر داخل ہوتے ہیں اور مرتے دم تک شاعر اور ادیب بن کر خون چوسنے، ہڈیوں سے گودہ نچوڑنے اور کینسر پھیلانے کا کام اتنی مہارت سے کرتے ہیں کہ کسی کو خبر تک نہیں ہونے دیتے۔ یہ وائرس ڈرامے لکھتے ہیں، اخبارات کے ادبی صفحات پر قبضہ کرتے ہیں، کالم نگار بنتے ہیں، بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھتے ہیں، ملک کی بیوروکریسی کی صفوں میں گھستے ہیں اور مشاعروں کی لابنگ کرتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو یہ گھٹیا درجے کے مفادات حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنی کوتاہ قامتی اور جعلی ہونے کے خوف سے ہر اس جینوئن تخلیق کار کا راستہ روکتے ہیں جس کے نمایاں ہونے سے ان کا زہریلا اور ادب کش بونا ایکسپوز ہوتا ہے۔ میں نے پچھلے تیس برسوں میں ان کے پھیلائے ہوئے کینسر کی زد میں آ کر مرتی ہوئی تین نسلوں کو دیکھا ہے۔ مشاعروں میں انھوں نے ادب سے محبت کرنے والے حاضرین کو مار دیا، بیوروکریسی میں صاحبان ذوق افسران کو بیمار کر دیا کہ وہ ان کو ہی حقیقی شاعر ادیب سمجھنے لگے اور نئے آنے والے شعرا اور ادیبوں کی جوانیاں لے ڈوبے۔ یہ روزانہ کی بنیاد پر بیس بیس گھنٹے لابنگ کرتے ہیں، میرے جیسے تخلیق کاروں کے خلاف زہر اگلتے ہیں اور پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ یوں سمجھے یہ وائرس سچے ادب کے خلاف ہر وقت حالت جنگ میں رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے حقیقی اور بڑے تخلیق کار سامنے نہیں آ پاتے۔ اب آپ خود دیکھیں حقیقی ادب اور ادیب کو کتنے بڑے بڑے خوفناک چیلنجز کا سامنا ہے۔ ایک طرف زہریلے مدرسین، دوسری طرف یہ وائرس، تیسری طرف ادب دشمن طبقات اور چوتھی طرف وہ گروہ جو سمجھتے ہیں کہ کسی بھی قوم کو مارنا ہو تو اس کے تخلیق کار کو مار دو۔ اب یہ

نظام فطرت ہی ہے جو ان سب شیطانی قوتوں کے مقابلے میں سچائی کا دفاع کرتا رہتا ہے۔ میرے نزدیک ہماری ادبی فضا کا ایک اجمالی جائزہ یہی ہے تفصیلات میں جائیں تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

سوال: آپ سے آخری سوال ہے کہ نئے لکھنے والوں کو اس فضا سے نکلنے یا بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

☆.....☆ یہ سب سے اہم اور قیمتی سوال ہے۔ کہ نیا لکھنے والا ایسی فضا میں کس طرح سانس لے؟ میں ایک بات کی وضاحت پہلے ہی کر دوں کہ میرا جواب ہر نئے لکھنے والے کے لیے نہیں ہے۔ صرف ان نئے لکھنے والوں کے لیے ہے جو اپنے فطری میلان کے باعث لکھنے کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ جو لوگ شہرت، شغل یا کسی دوسرے سرسری مقصد کے تحت ادیب یا شاعر بننا چاہتے ہیں وہ کچھ بھی کر لیں اچھا یا بڑا شاعر ادیب کبھی بھی نہیں بن پائیں گے اگر ایسا ہوگا تو وہ کوئی انہونی ہی ہوگی۔ ادب پورا آدمی اور پوری زندگی مانگتا ہے۔ اگر تو کوئی اتنی بڑی قربانی دے سکتا ہے تو ضرور آئے۔ بصورت دیگر کوئی داد لگا بھی لے گا تو پھر بھی اندر سے کبھی مطمئن نہیں ہو پائے گا اور اس سچی خوشی سے محروم رہے گا جو ایک جینوئن تخلیق کار کو حاصل ہوتی ہے۔ ایک نئے سچے لکھنے والے کو سب سے پہلے اپنی صحبت اور میل جول سچے اور مخلص تخلیق کاروں سے رکھنا ہوگا جہاں اسے حقیقی ادب کے عالمی مطالعے کا کلچر ملے۔ وائرس اور سستے ادیبوں سے دور رہنا ہوگا چاہے اکیلا ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔ کتاب سے دوستی نہیں بلکہ عشق پالنا ہوگا۔ لکھتے وقت ارد گرد کے شاعروں ادیبوں کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنی ذاتی کیفیات اور خیالات کو ترجیح دینی ہوگی۔ عارضی اور فوری ٹرینڈز کے دباؤ سے خود کو محفوظ رکھنا ہوگا۔ ذاتی مفادات کی کمزوری کا شکار ہو کر معاشرے کی بے انصافیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے احساساتی اور فکری سطح پر مزاحمتی رویہ اور کردار اپنانا کسی بھی رائیٹر کے لیے انرجی کا کام کرتا ہے۔ یہ انرجی حاصل کرنی ہوگی۔ اپنے کام سے محبت کے ساتھ مسلسل جڑا رہنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اچھے اور بڑے تخلیق کاروں کو عزت اور احترام دینے سے بھی برکت ملتی ہے اسے اپنے کردار کا حصہ بنانا ہوگا۔ اپنی تخلیقات سے سچی خوشی کے علاوہ دنیاوی فوائد کی توقع سے دور رہ کر احساس اور علم کی ریاضت کے لیے زندگی کو وقف کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر بہتر یہ ہے کہ کسی اور کام کو اختیار کر لیا جائے۔

☆☆☆☆☆

پاکستانی غزل 2010 کے بعد

سجدے میں کھل رہے ہیں معانی قیام کے

شاعرِ امروز

اسامہ عندلیب

شاہد ماکلی

اسامہ عندلیب تکثیری ساجیات کا ایک جدید فرد ہے مگر ان کا فکری سفر تکثیریت سے وحدت کی طرف ہے۔ روحانیت کی طرف جھکاؤ ان کی غزل میں ایک غالب رجحان کے طور پر موجود ہے۔ خارجی اور داخلی تناظرات کے تضاد نے ان کے اندر ایک طرح کا روحانی اضطراب پیدا کر دیا ہے؛ اور یہی اضطراب ان کی تخلیقیت کا بڑا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔ خدا سے ان کا رشتہ روایتی صوفیت سے ہٹ کر، باطنی کش مکش کے اُن لمحوں میں استوار ہوا ہے جن سے آج کا مابعد جدید ذہن دوچار ہے۔ مابعد جدیدیت مہابیانیوں کو چیلنج کرتی ہے اور فرد کو ہر طرح کی ماورائی وابستگی سے توڑ کر لامرکزیت کی طرف دھکیلتی ہے۔ اسامہ عندلیب کے ہاں اس دھکیلے جانے کے عمل کے خلاف ایک مزاحمتی قوت بطور ردعمل پائی جاتی ہے۔ یہی قوت ان کے اندر جینے کی شدید خواہش اور مرکز سے جڑے رہنے کے جذبے کو ابھارتی ہے اور ایسے ایسے تازہ، تیکھے اور چمک دار شعر کہلواتی ہے جو کسی شاعر کو انکشافی ساعتوں میں گہرے روحانی تجربے کے تحت ہی نصیب ہوتے ہیں۔

اسامہ عندلیب 30 جون 1999 کو تحصیل خانپور میں پیدا ہوئے۔ بی ایس ماس کمیونیکیشن میں ڈگری حاصل کی۔ 2018 سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ذیل میں ان کے چند منتخب اشعار:

ہاں، خدا کا رازداں ہوں، مار دو
مارنے سے راز مر جائیں گے کیا

میں زندگی کو بڑی شان سے پہنتا تھا
اور اب یہ کپڑا صفائی کے کام آتا ہے

میں کھینچ لیتا ہوں گھر میں بڑی سہولت سے
کوئی مکان نہیں ہے مرے مکان کے ساتھ

اس قدر مختصر تھی کیفیت
خود پہ طاری بھی کر نہیں پائے

بہت آباد ہوتی تھی یہ دنیا
نئے ذہنوں کی دلچسپی سے پہلے

دسترس کس قدر بُری شے ہے
میں تری جستجو نہ کر پایا

ہم نے مالی کی مشقت کا بھرم رکھنا تھا
سو جہاں کوئی نہ مہکا تو وہاں ہم مہکے

اُس کو باہر لے آؤں تو مجھ پر پتھر برسیں گے
اک ایسی آواز سنی ہے میں نے اپنے اندر سے

اب اُس کو کسی جھوٹ سے کرنا ہے مجھے رام
گرویدہِ اخلاص تو ہونے سے رہا وہ

مشکلیں ہیں، کوئی تہوار نہیں ہے مرے دوست
آدمی پہلے سے تیار نہیں رہ سکتا

اپنے معمار پہ اتنا تو بھروسہ ہے مجھے
عمر بھر میں یونہی مسمار نہیں رہ سکتا

آسماں ہی آسماں تھا چارسُو
میں نے سمجھا یہ دعا کا وقت ہے

کہ سننے والا پھر سوتا نہیں ہے
خدا کی لوریاں اتنی جدا ہیں

یارو مجھے اُس چشمِ تغافل میں نہ ڈھونڈو
گھر کی کسی تصویر میں نوکر نہیں آتا

یہ میں ہوں پلٹ آیا ہوں واپس مری جانب
ورنہ تو کوئی شخص بھی جا کر نہیں آتا

ہوتا تھا اُن دنوں بھی مجھے حکمِ درگزر
جب بہترین دن تھے مرے انتقام کے

جھکنے سے ہو رہی ہے مرے قد کی پرورش
سجدے میں کھل رہے ہیں معانی قیام کے

ہم دونوں اس طرح سے برابر خموش تھے
معنی سمجھ میں آنے لگے ہم کلام کے

ہم کسی تفصیل کے قابل نہیں
ہم سرِ آغاز مر جائیں گے کیا

میں اسامہ سوچتا ہوں ، موت سے
زندگی کے راز مر جائیں گے کیا

ایک منزل ہے ہماری آنکھ میں
اور ہم پر راستے کی آنکھ ہے

اک دن میری آنکھ کھلی
اور کھلی بیداری میں

دن کا وقت بھی آتا ہے
اکثر شب بیداری میں

پودے خود بتلاتے ہیں
کون آیا تھا کیاری میں

بیکاری پر نظم کہی
کیا کرتا بیکاری میں

کسی نے کیا اُٹھانا ہے یہاں مصرع کسی کا
کوئی تسلیم ہی کرتا نہیں رتبہ کسی کا

یہی اک بات جینے کی طرف لاتی ہے ہم کو
ہماری موت سے کچھ بھی نہیں جاتا کسی کا

مجھے تو حکم ہے ، سو درگزر کروں گا مگر
یہ بُردباری کہیں تجھ سے انتقام نہ ہو

اے خدا کیا یہ کیفیت بھی مری
لوحِ محفوظ پر لکھی ہوئی ہے !

جو کارِ عشق میں عرصہ لگا کے بیٹھے ہیں
ہم ان کے سامنے چشمہ لگا کے بیٹھے ہیں

میں جن کی جیت پہ خوشیاں منایا کرتا تھا
وہ میری ہار پہ پیسہ لگا کے بیٹھے ہیں

بیٹھے رہو تو سہل نہیں ہے خدا کی راہ
اور چل پڑو تو ایک قدم کا سفر نہیں

میرا خدا کی ذات پہ اتنا یقین ہے
میں صبر مانگ لیتا ہوں اُس سے، ثمر نہیں

صاحب یہ میرا شعر ہے مشہور شعر ہے
اس سے نظر ہٹایئے اپنا اٹھایئے

مجھے عام لوگوں میں مت پڑھو کہ خدا کا میں
کسی کیفیت میں کہا ہوا کوئی شعر ہوں

میں چاہتا تھا، میرے لئے بھی مرے کوئی
پھر ایک روز میرے لئے مر گیا وہ شخص

ہم تری زلف کے سائے کو بہت دن ترسے
اور پھر ہم نے درختوں پہ قناعت کر لی

آرزوئے ثمر نہیں کرتے
دامنِ صبر تھامنے والے

میں سوچتا ہوں ، سب سے بہت کم ملا کروں
میں چاہتا ہوں ، سب سے مرا رابطہ رہے

مجھ کو مرے خدا سے بڑے اور کام ہیں
کب تک کوئی دعا میں تجھے مانگتا رہے

کوئی جگہ تو ہو میں جہاں پر ٹھہر سکوں
کوئی نشہ تو ہو جو بہت دیرپا رہے

مری صدق گوئی بھی فائدہ نہیں دے رہی
کوئی شخص بھی مری بات میں نہیں آ رہا

حجرہ اعتکاف ہوں ان کا
زخم ، مصروفِ ذکر ہیں مجھ میں

میں آج اُس کی طرف سے بھی رونے والا ہوں
سو آج ایک دلاسہ مجھے اضافی ملے

☆☆☆☆☆

غزل

کون کرے مسمار
رستے کی دیوار

خالی ہاتھ چلے
آئے تھے بازار

کرن کرن جاگی
کون ہوا بیدار

لوٹ نہ لے موسم
پتوں کا گھر بار

شہر نہ چھوڑیں گے
شہروں کے آثار

شیشے کے انسان
پتھر کا سنسار

تم کو تلاشِ وفا
ہم کو تم درکار

کھل کھل کر برسے
رمِ جھم کے اسرار

پیار ، محبت کیا؟
جذبوں کا بیوپار

گھور کے دیکھ ہمیں
دے خنجر کو دھار

ناقد کھیلیں گے
شاعر کا کردار

گیت ، غزل ، کافی
لفظوں کے انبار

خالد نے دیکھے
رُوح بکف فنکار

خالد احمد

غزل

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

رَمز کی بات کس طرح کیجے
آئینہ ہو گئے اشارے بھی

سانس کے ساتھ رُک گئیں نبضیں
تھم گئے آنسوؤں کے دھارے بھی

کچھ تلوّن مزاج ہم بھی ہیں
ان گنت روپ ہیں تمہارے بھی

دشمنوں میں تہی نہیں یکتا
شہر میں دوست ہیں ہمارے بھی

ہجر نے ہم کو لازوال کیا
نفع دیتے ہیں کچھ خسارے بھی

صرف سچ لکھ رہے ہوں اہل قلم
کلک پر چل رہے ہوں آرے بھی

آسمان پر شفق کی لالی ہو
جل اُٹھیں شہر کے کنارے بھی

چاہتیں کب ہیں صرف باتیں ہیں
جانِ جاں کوئی جان وارے بھی

اِن سُروں میں فتور کتنا ہے
کوئی بھرتا یہ گوشوارے بھی

کیسی ٹھنڈی ہوا چلی خالد
چاند کیا ، جل بجھے ستارے بھی

خالد احمد

غزل

سب تماشا ایک پل
ہے یہ دنیا ایک پل

زندگی تھی بے کراں
ہم نے دیکھا ، ایک پل

پھیر لی دل نے نظر
جس نے سوچا ایک پل

اب بھی ہے محوِ سفر
"کن" سے پھوٹا ایک پل

وقت سے باہر رہا
اُس کا بخشا ایک پل

فرصت ہستی ہے کیا
ایک لمحہ ، ایک پل

ایسے گزری زندگی
جیسے گزرا ایک پل

تم تھے عمرِ جاوداں
میں تھا گویا ایک پل

خاک سے ، افلاک تک
کیسے پھیلا ، ایک پل؟

جھیل روشن ہو گئی
چاند چمکا ایک پل

بن رہے تھے سب خدا
کس نے روکا ایک پل

ہم پہ برسا ٹوٹ کر
بے تحاشا ، ایک پل

پھر کبھی لوٹا نہیں
پہلے جیسا ، ایک پل

واپسی ممکن نہیں
کہہ کے گزرا ، ایک پل

اس فشارِ وقت میں
بس ہے اپنا ایک پل

یہ بھی تو اپنا نہیں
یہ ہمارا ایک پل

سب ہیں اس کے ہم سفر
کب ہے تنہا ایک پل

پھر نہ امجدؔ سو سکا
جو بھی جاگا ایک پل

امجد اسلام امجد

غزل

کیوں نہ پھر شہرِ خجالت سے زمیں میں گڑ جائے
جب سیاست بھی عدالت کو چلانی پڑ جائے

یار اُس کا بھی خلا بھرتا ہے بھرتے بھرتے
اک ستارہ جو کسی شاخِ فلک سے جھڑ جائے

باندھ کر سر پہ کفن نکلے ہیں شیدا تیرے
کس کو پروا ہے جو اِس راہ میں سر دھڑ جائے

راہ رہ جائے نہ کوئی بھی بقا کی جس دم
کاہ بھی کوہ سے اُس حشر سے لڑ جائے

زندگی کیا ہے فقط بے کلی و بے تابی
وہ جو آسودۂ کل ہو رہے گل سڑ جائے

خود عذابی بھی کوئی اِس سے بڑی کیا ہو گی
آدمی کر کے غلط بات پھر اُس پر اَڑ جائے

شاعروں کے بھی تخیّل کی وہ دنیا میں کہاں
جن علاقوں کے فسوں کھوجتے تارڑ جائے

دائم آباد رہے دائرہ اہلِ دل کا
کبھی اک درد الاؤ کی نہ بھڑ بھڑ جائے

ڈر ہے حکمت سے نہ گر ہم نے سنبھالی عالی
دے کے اک دَورِ قیامت نہ یہ گڑ بڑ جائے

جلیل عالی

غزل

دن کام کے بغیر، شب آرام کے بغیر
کی ہم نے زندگی روشِ عام کے بغیر

تم کیا ہوئے غروب کہ کوئی سحر نہ شام
ہم نے گزار دی سحر و شام کے بغیر

جنگ و جدل سے پاک نہ رہتی زمین کیا
ہوتی اگر ممالک و اقوام کے بغیر

فکرِ معاش میں ہوسِ مہ وشاں کہاں
دل کا صنم کدہ ہے اب اصنام کے بغیر

وہ آئیں لوٹ کر کہ نہ آئیں، خبر نہیں
ہے میری سرگزشت ابھی انجام کے بغیر

دنیا میں جاننا ہو مرا حال اگر تمھیں
بازار گھوم لو درم و دام کے بغیر

رندی و مکشی کی طرف بالعموم لوگ
کھنچتے ہیں خود بخود کسی پیغام کے بغیر

اتنی طویل عمر میں اے کاش ہم کبھی
دو چار دن گزارتے آلام کے بغیر

شاعر ہو اے شعورا پیغمبر نہیں ہو تم
کرنی ہے شاعری تمھیں الہام کے بغیر

انور شعور

غزل

دکھائیں زخم تمنا یہ اپنی خو بھی نہیں
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو بھی نہیں

یہ خوب موسمِ گل ہے چمن میں اہلِ چمن!
کہ بزمِ عیش میں رندوں کی ہاؤ ہو بھی نہیں

جلے نہ آتشِ غم سے طنابِ خیمۂ دل
قریبِ دشتِ جنوں اب تو آبجو بھی نہیں

بڑے خلوص سے ہم نے کیا تھا عہدِ وفا
خطا معاف کہ اب اس کی آرزو بھی نہیں

ہمیں تو اس کی نگاہِ کرم کا پاس رہا
وگرنہ ہاتھ میں اپنے کوئی سبو بھی نہیں

کسی کے پھول سے چہرے کی یاد کیوں آئی
ہماری چشمِ تصور تو باوضو بھی نہیں

کچھ ایسے الجھے حسن گردشِ زمانہ میں
جہانِ شوق میں اب اس کی جستجو بھی نہیں

حسن عسکری کاظمی

غزل

کل تک تھے صرف میرے ستارے مرے خلاف
اب ہو گئے ہیں دوست بھی سارے مرے خلاف

تھا ہی نہیں شریک مَیں جس کاروبار میں
اُس کے لکھے گئے ہیں خسارے مرے خلاف

ہم نے تو اِس کا کچھ بھی بگاڑا نہیں، مگر
رہتا ہے کیوں زمانہ تمہارے مرے خلاف؟

کیوں یہ زمیں بھی بوجھ سمجھنے لگی مجھے؟
کیوں آسماں کے بھی ہیں اشارے مرے خلاف؟

جینا مرے لئے کوئی آساں نہیں رہا
دھارے مرے خلاف، کنارے مرے خلاف!

مَیں تب بھی سطحِ آب سے نیچے نہیں گیا
طوفان تو بھنور نے اُبھارے مرے خلاف

بیعت بھی میرے ہاتھ پہ پہلے اُسی نے کی
لشکر بھی پھر اُسی نے اُتارے مرے خلاف

یہ جُرم ہے کہ ٹوٹ کے چاہا ہے ہیر کو
چوپال، بیلے، تخت ہزارے مرے خلاف!

دیدہ دلیری یارِ منافق کی خوب تھی
تھا وہ کھڑا مرے ہی سہارے مرے خلاف

اُس فردِ جرم کا اُنہیں اب خود ہے سامنا
ثابت نہ کر سکے جو بچارے مرے خلاف

دے تو سہی دفاع کا حق وہ مجھے نسیم
جو کوئی عرضداشت گزارے مرے خلاف

نسیم سحر

غزل

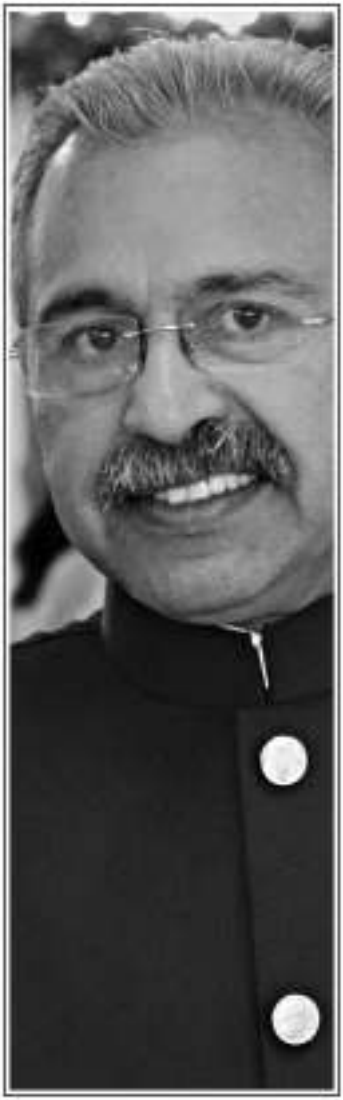

جاگ کر کیا کروں گا خواب سے میں
معذرت خواہ ہوں جناب سے میں

جی رہا ہوں چراغ کی لو پر
ہو کے مایوس آفتاب سے میں

ایسا لگتا ہے زندگی ساری
جیسے نکلا نہیں سراب سے میں

ڈال آیا ہوں اس کو چکر میں
دے کے تشبیح ماہ تاب سے میں

فاختہ جیسی سادگی پہ نہ جا
کم نہیں ہوں کسی عقاب سے میں

مصلحت خون میں نہ تھی ورنہ
بچ تو سکتا تھا ہر عتاب سے میں

کون تعبیر دیکھے گا راحت
لوٹ پایا اگر نہ خواب سے میں

راحت سرحدی

غزل

چاہو تو ، بیتے لمحات پلٹ بھی سکتے ہیں
چاہو تو، ماضی کی دُھول میں اَٹ بھی سکتے ہیں

گچ فہمی کا ایک ہی وار اگر کاری نکلا
پیار بھرے دل اک دُوجے سے کٹ بھی سکتے ہیں

بچھڑے، تو ممکن ہے ساری عُمر نہ مل پائیں
کالے بادل تھوڑی دیر میں چھٹ بھی سکتے ہیں

ہر ناممکن ، ممکن ، ممکن ، ناممکن ہو جائے
پھیلتے پھیلتے یہ حالات سمٹ بھی سکتے ہیں

کسی بھی لمحہ کُھل سکتا ہے قُفلِ زباں بندی
یہ سب اندھے، گونگے، بہرے ڈٹ بھی سکتے ہیں

پاؤں ہیں، تو وقفِ سلاسل بھی ہو سکتے ہیں
ہاتھ ہیں، تو سچ لکھتے لکھتے کٹ بھی سکتے ہیں

'اِن' بھی رہ سکتے ہیں ہم، منظر میں جانِ انیس!
اور کبھی منظر نامے سے ہٹ بھی سکتے ہیں

محمد انیس انصاری

غزلیں

اک آوازِ ہُو آئے
من میں چھَن سے تُو آئے

دور گئے کی یادوں کی
رات گئے خوشبو آئے

بادِ صبا سا اک چہرہ
روٹھا ہے تو لَو آئے

ہونٹ رکھے ہیں آنکھوں پر
قوسِ قزح کو چھو آئے

اوٹ سے ذرّہ دیکھے گا
سامنے وہ مہ رُو آئے

چشمِ سیہ سرشار کرے
زم کرتا آہو آئے

ایسے استقبال ہوا
دو سمٹے بازو آئے

قیوم طاہر

دکھ دریا تیز بہاؤ کا
کیا ہو گا جاں کی ناؤ کا

کیا دیکھیں باٹ ترازو کو
کیا عشق میں سودا بھاؤ کا

کچھ سرخ سے بال و پر نکلے
اک موسم مہکا گھاؤ کا

تب الجھا ذات کے ریشم میں
جب وقت ملا سلجھاؤ کا

اس آنکھ کھنڈر میں دکھتا ہے
اک رنگ قدیم الاؤ کا

کچھ سانس کی پونجی باقی ہے
اک آخری موقع داؤ کا

اب طاہرؔ صاحب لاد چلیں
اتنا تھا سہے پڑاؤ کا

غزل

جلا کے اپنا وجود ظلمت کو ٹالنے میں لگے ہوئے ہیں
چراغ تیرے لیے فضا کو اُجالنے میں لگے ہوئے ہیں

تجھے خبر ہی نہیں کہ تیرا جمال تصویر ہو رہا ہے
اِدھر اُدھر آ کے ترا عکس ڈھالنے میں لگے ہوئے ہیں

ترے کرم نے جگہ عطا کی جنھیں کہانی میں ساتھ اپنے
ترا ہی کردار داستاں سے نکالنے میں لگے ہوئے ہیں

اگر کریں غور علم ہو آ چکا ہے برسات کا بھی موسم
مگر ترے ہم نشیں نشستیں سنبھالنے میں لگے ہوئے ہیں

کنویں سے کتنا ہے گا پانی کے نہیں جانتے ہیں پھر بھی
بساط بھر تشنہ لب ترے ڈول ڈالنے میں لگے ہیں

کوئی مسیحا نفس بھی شاید ہمیں شفایاب کر سکے گا
کچھ اس طرح ہم عجیب سے روگ پالنے میں لگے ہوئے ہیں

ملے نئے ڈھنگ جن کے دم سے فریب کاری کے سلسلوں کو
وہ پارسا عیب دوسروں کے اچھالنے میں لگے ہوئے ہیں

نڈھال خلقِ خدا کو شدت کی بھوک نے کر دیا ہے لیکن
بہانہ جو مہربان پتھر اُبالنے میں لگے ہوئے ہیں

ہمیں ہے گلزار ساحلی سیپیوں سے امید موتیوں کی
حریف گہرے سمندروں کو کھنگالنے میں لگے ہوئے

گلزار بخاری

غزل

جلوہ نما ہے آج بھی یوں زرد زرد چاند
جیسے دفورِ غم سے ہو تصویرِ درد چاند

اُن کے حسین رُخ پہ ہیں شمس و قمر نثار
اُن کی جبینِ ناز کے آگے ہے گرد چاند

شاید بچھڑ گیا ہے یہ اپنے حبیب سے
تاروں کی چھاؤں میں ہے جو صحرا نورد چاند

وہؐ مظہرِ کمال ، وہؐ مولائے حسن و عشق
اُنؐ کے ہے ایک نقشِ کفِ پا کی گرد چاند

کیا بات ہے کہ عشق کی گرمی سے ہے تہی
ہے روشنی ہی روشنی لیکن ہے سرد چاند

وہ راہروانِ شوق جو منزل کو جا چکے
اُس قافلے کا بچھڑا ہوا سا ہے فرد چاند

ڈھلا گیا ہے محلِ شب کے فراق میں
اے آفریں! نہ لا سکا تابِ نبرد چاند

رشید آفرین

غزلیں

شہر سنسان ہو گئے چپ چاپ
کیسے سامان ہو گئے چپ چاپ

آئنوں پر غبار کیسا تھا
عکس حیران ہو گئے چپ چاپ

موسم نے عجیب کروٹ لی
باغ حیران ہو گئے چپ چاپ

تو نے آنکھوں میں دی جگہ تو ہم
تیرے مہمان ہو گئے چپ چاپ

آنکھ میں جھلملانے والے بھی
کوئی ارمان ہو گئے چپ چاپ

نثار ترابی

زندگی کی اساس ہو جیسے
تو مری غم شناس ہو جیسے

خواہشِ دل ہے بے حجابی میں
آرزو بے لباس ہو جیسے

دل کو اصرار ہے دھڑکنے پر
تیرے ملنے کی آس ہو جیسے

اپنے باغوں سے ہو کے آئی ہو
اپنے پھولوں کی باس ہو جیسے

جیسے اک شام ہو جدائی کی
پھر طبیعت اُداس ہو جیسے

غزلیں

ہے کون جو دُنیا میں گنہ گار نہیں ہے
بندہ ہی تو ہر دُکھ کا سزاوار نہیں ہے

کیا ہوگا اَب اِس سے تو سروکار نہیں ہے
یا ہم نہیں یا راہ کی دیوار نہیں ہے

ہم عشق پرستوں کی نہ کر پیروی یوں ہی
اے شیخ! یہ رستہ کہیں ہموار نہیں ہے

انسان بھی ہے واقفِ اسرارِ نہانی
جبریل ہی کچھ محرمِ اسرار نہیں ہے

کہنے کو اِسے باغِ جہاں کہتے ہیں لیکن
ہر گوشہ یہاں کا گل و گلزار نہیں ہے

دُنیا! ہمیں بھیجا گیا یاں ایک سبب سے
ورنہ ہمیں کچھ تجھ سے سروکار نہیں ہے

خاور اعجاز

اے دوست! اِس قدر مجھے اذنِ کلام ہو
محفل میں خاص و عام کو میرا سلام ہو

اِس بے خُودی نے خُود میں نہ رہنے دیا تو کیا
تلوار تو وہی ہے کہ جو بے نیام ہو

یوں ہی نہیں اشارے کیے جا رہا وہ آج
ممکن ہے اُس کو مجھ سے کوئی کام وام ہو

پھرتے ہو بیچ مسجد و بت خانہ بے محل
یارو ابھی تم اپنے ارادوں میں خام ہو

بوسے کے بعد وصل کی خواہش، حیا کرو
خاورؔ! اَب اِس قدر بھی نہ تم بے لگام ہو

غزل

خواب اپنا قریں کا تھا ہی نہیں
وہ ستارا جبیں کا تھا ہی نہیں

بے یقینی کی بات کیا کرتے
مسئلہ تو یقیں کا تھا ہی نہیں

آسماں سے مجھے اتارا گیا
یار میں تو زمیں کا تھا ہی نہیں

کوئی نظر کرم ہوئی مجھ پر
ورنہ میں تو کہیں کا تھا ہی نہیں

دھوپ چھاؤں میں زندگی گزری
کچھ پتہ اس حسیں کا تھا ہی نہیں

اے والا بھی جانے والا تھا
یہ مکاں تو مکیں کا تھا ہی نہیں

سعد اس سے سوال کیا کرتے
ہاں جواب اس نہیں کا تھا ہی نہیں

سعد اللہ شاہ

غزلیں

ٹھہرایئے نہ دہر کو تنہا قصوروار
ہاں دیکھئے کہ کون ہے کتنا قصوروار

مہنگا پڑا ہے دامنِ یوسف کو کھینچنا
ثابت ہوا ہے دستِ زلیخا قصوروار

چشمک اگر ہے سوہنی و سسّی کے درمیاں
دریا کا کوئی جرم نہ صحرا قصوروار

قابیل! اپنے جرم کی تشدید دیکھ لے
ٹھہرا ہے تُو زمین پہ پہلا قصوروار

گمگشتگانِ راہ کے جب ہوش اُڑ گئے
نقشہ درونِ شہر کا ٹھہرا قصور وار

یعقوب پرواز

تقدیم کے مقام سے آگے نکل گئے
کچھ مقتدی امام سے آگے نکل گئے

اس عہدِ بے مہار کا یہ المیہ بھی دیکھ
کچھ لوگ بے لگام سے آگے نکل گئے

حیرت کا ہے مقام کہ ہم سے شکستہ پا
یارانِ تیز گام سے آگے نکل گئے

ایسے معاصرین سے کیسی مسابقت
جو ریگزارِ عام سے آگے نکل گئے

رفتارِ فکر اُن کی بڑا کام کر گئی
شاعر جو اپنے نام سے آگے نکل گئے

اُس صاحبِ کمال کا ثانی کہاں کہ جو
پرواز ہر مقام سے آگے نکل گئے

غزل

منظور ثاقب

خوشی کا راز آخر پا گئے ہیں
غموں کی تال پر جو ناچتے ہیں

عدم سے خوف کیوں ہو، زندگی سے
بہت گہرے ہمارے رابطے ہیں

ہمی تحریر کرتے ہیں مقدر
مہ و انجم ہمارے سلسلے ہیں

وہ کانٹوں کی بھی عزت کے ہیں قائل
جو پھولوں سے تعلق پالتے ہیں

نہ ان کے درمیاں اب جنگ ہوگی
وہ اپنے مسئلوں میں گھر گئے ہیں

سٹیٹس جانتا رہتا ہوں اپنا
مقابل قد آدم آئینے ہیں

وہ مقصود اپنا پا لیتے ہیں آخر
جو دشت فکر ثاقب چھانتے ہیں

غزل

باخبر ہوتے ہوئے بھی ، بے خبر ہو جایئے
آپ ناواقف نہیں مجھ سے ، مگر ہو جایئے

زندگی بھر کون ہوتا ہے کسی کا ہمسفر
چند لمحوں کے لئے بس ہمسفر ہو جایئے

عمر بھر زخموں کی شدت سے رہا جو بے سکوں
ایک دن تو آپ اُسکے چارہ گر ہو جایئے

دیکھ کر حالات کر لیجے خوشی سے خودکشی
روز ناموں کے لئے پہلی خبر ہو جایئے

ہر جگہ زہریلے منظر کاٹنے کو آئیں گے
سنگدل ہو جایئے، اور بے بصر ہو جایئے

وقت کی سولی پہ سجنے کا اگر ہے حوصلہ
شوق سے پھر شاملِ اہلِ ہنر ہو جایئے

اس بھری دنیا میں جس جانب بھی اٹھتی ہے نظر
سب فرشتے ہیں فرشتوں میں بشر ہو جایئے

شہر میں اقبال پھر توقیر ہوگی آپکی
سب سے پہلے گھر میں اپنے معتبر ہو جایئے

اقبال سروبہ

غزل

جب بھی احساس کے پردے سے عیاں آپ ہوئے
کتنے اشعار کی صورت میں بیاں آپ ہوئے

کتنا اچھا ہے ہمارا یہ اکیلا پن بھی
جس طرف لے گئی تنہائی وہاں آپ ہوئے

دور رہتے غمِ ہستی کے جھمیلے ہم سے
اِتنے نزدیک مری جان کہاں آپ ہوئے

ہم نفس موردِ الزام نہیں تیرہ شبی
یہ دیے خود سے ہی جل مل کے دھواں آپ ہوئے

کیوں سرِ محفلِ اعدا اُنھیں اَپنا سمجھا
ہم بھی یاروں کے لیے بارِ گراں آپ ہوئے

بے تکلف سرِ محفل ہوئے ہم اُن سے ضرور
اور اپنے لیے خود دشمنِ جاں آپ ہوئے

جھوٹ سُن کر بھی بہت ہم نے تحمل برتا
سچی باتوں پہ مگر شعلہ بجاں آپ ہوئے

اک حقیقت تھا کبھی رشتۂ جاں آپ کے ساتھ
اَب تو خوابوں کی طرح وہم و گماں آپ ہوئے

لوگ کہتے ہیں ہمیں کچھ بھی، اُنھیں کہنے دو
کس کے کہنے پہ زمانے کی زباں آپ ہوئے

ہر غزل لے کے نیا درد اُترتی ہے حریم
اِک نئے طور سے پھر محوِ فغاں آپ ہوئے

حریم حیدر

غزل

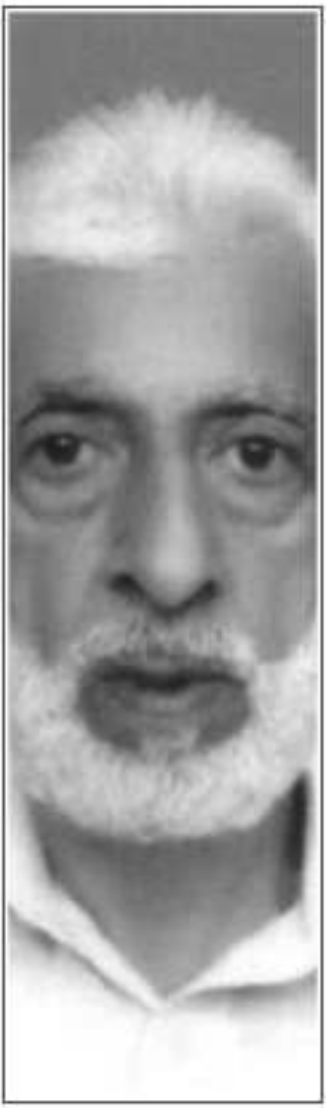

کرے سوال اندھیرا ، جواب رکھتا ہوں
میں اپنے پاس ابھی آفتاب رکھتا ہوں

سمجھ سکے گا مرا زخم کس طرح کوئی
میں اپنے زخم پہ اتنے نقاب رکھتا ہوں

نہیں ہے خوف خزاں کا جنھیں ذرا سا بھی
میں تیری یاد کے ایسے گلاب رکھتا ہوں

جہاں کی نفرتیں کیسے گرا سکیں گی مجھے
محبتوں کا سہارا جناب رکھتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ نیت ہے دوستوں کی کیا
میں اپنے پاس اک ایسی کتاب رکھتا ہوں

بچھڑنے والے خود آئیں گے پھر مری جانب
کشش میں خود میں کچھ ایسی جناب رکھتا ہوں

کوئی عذاب مجھے اور کیا ستائے گا
میں اُس کے ہجر کا شاہد عذاب رکھتا ہوں

ہمایوں پرویز شاہد

غزلیں

آنکھ میں ایک بھی دُکھ کم نہ کریں، مُسکائیں
زائل اس پھول کی شبنم نہ کریں، مُسکائیں

لِکھ دیا میرے مسیحا نے سبھی نسخوں پر
خوش رہیں آپ، ذرا غم نہ کریں، مُسکائیں

ہم جو دیوانے ہوئے، اہلِ خرد نے یہ کہا
ان پہ کچھ بھی نہ پڑھیں، دم نہ کریں، مُسکائیں

ہم کو صحراؤں نے سو بار نصیحت کی تھی
روتے دم اپنی پلک نم نہ کریں، مُسکائیں

اور کیا رکھا ہے کرنے کو، سو کرنے دے ہمیں
اَب تجھے یاد بھی ہمدم نہ کریں، مُسکائیں

بیٹھے، نمکین کا اِک فرق ہیں یہ ہجر و وصال
ڈالئے دونوں کے یوں ضم نہ کریں، مسکائیں

آپ سے اتنی سی درخواست ہے رخشندہ جی!
سر اُٹھا رکھیں، اسے خم نہ کریں، مسکائیں

رخشندہ نوید

استقبال شجر کرتا ہے سو سو بار پرندوں کا
شاخ پہ بستر لگ جاتا ہے ایک ہزار پرندوں کا

اتنا بھی معلوم نہیں ہے ان منہ زور ہواؤں کو
تنکا تنکا جوڑ کے بنتا ہے گھر بار پرندوں کا

ہجرت کے اسباب میں شامل ہے تبدیلی موسم کی
لیکن اک محبوب بھی ہوگا دریا پار پرندوں کا

جب تک پنکھ نہیں اُگ آتے، جب تک اُڑ نہیں پاتی میں
کُھل نہیں سکتا اُس دن تک مجھ پہ اسرار پرندوں کا

باغوں میں وہ ساتھ تھے میرے، کل جب سیر کو نکلی تھی
آج کدھر سے نام پتا لوں؟ اُن دلدار پرندوں کا

گھر کی منڈیر پہ دانہ ڈال کے اِک برتن میں رکھ تو دیا
لیکن مرا خدا رازق ہے اِن نادار پرندوں کا

اور نشانی کیا ہو گی ہم سے مردم بیزاروں کی
دل میں گہری جڑیں پکڑتا ہوا یہ پیار پرندوں کا

خود کو مزین کیا ہے، جس صورت ان برتی تاروں نے
جی چاہے، رخشندہ! پہنوں گلے میں ہار پرندوں کا

غزل

رات بجھتے ہوئے شعلے کو اٹھایا ہوگا
شوق نے دل کو اندھیرے میں جلایا ہوگا

صبح ہنستے ہوئے اٹھا ہوں بہت وقت کے بعد
رات اک خندہ دہن خواب میں آیا ہوگا

کوزہ گر نے تری آنکھوں میں ستارے بھر کے
تجھ کو مہتاب کی مٹی سے بنایا ہوگا

خیرہ کرتا ہوا آنکھوں کو اجالا نکلا
تو نے دروازے سے چلمن کو ہٹایا ہوگا

دیکھ سکتی ہیں اندھیرے میں جو آنکھیں میری
تیری تصویر کو آنکھوں سے لگایا ہوگا

کس طرح لوٹ گیا وہ مرے دروازے سے
میرے بارے میں کسی نے تو بتایا ہوگا

گر پڑا آنکھ کی دہلیز پہ سورج بھی کمال
شام چپکے سے وہ جب دھیان میں آیا ہوگا

اشرف کمال

غزل

جیتیں اندر کی ہیں بابا ماتیں اندر کی
اندر سے تو جانیں سب ہی باتیں اندر کی

ہولے ہولے ڈھے جاتا ہے بندہ اندر سے
اپنا رنگ دکھاتی ہیں برساتیں اندر کی

خوشیوں کے موسم میں جاگیں اندر کے بھی دکھ
عیدیں اندر کی بابا شبراتیں اندر کی

سورج چاند ستارے سارے اپنے اندر کے
دن اندر کے ہیں تو یارو راتیں اندر کی

یوں تو سارے گھات لگائے بیٹھے ہیں لیکن
ایک وہی ہے جو جانے سب گھاتیں اندر کی

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک عمر ہم لکھتے رہے اک عمر ہم بکتے رہے
کیا کیا نہ جاں پر قرض تھے سر سے اتارے کس طرح

غزل

طالب انصاری

ایک ہی شب چہرہ دیکھا تھا تمھارا خواب میں
ہم نے باقی عمر کا حصّہ گزارا خواب میں

نقش کر لوں گا میں اس کی شکل اب کے ذہن میں
بس نظر آ جائے وہ مجھ کو دوبارہ خواب میں

صبح دم اس کی کئی انداز سے تجسیم کی
رات بھر جو اک ہیولہ سا ابھارا خواب میں

آسماں پر مجھ کو جانے کا بہانہ مل گیا
میں نے اس کی مانگ میں دیکھا ستارا خواب میں

پھر اچانک یوں ہوا آنکھیں سمندر ہو گئیں
مجھ کو آتا تھا نظر اکثر کنارا خواب میں

جاگتی آنکھوں سے جس کو دیکھنا ممکن نہ تھا
وہ میسّر آ گیا سارے کا سارا خواب میں

زندگی کی رونقیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں
کر رہا ہو جس طرح کوئی نظارا خواب میں

غزلیں

اَک اِک کر کے بھول گیا ہوں سارے اچھے خواب
ذہن سے میرے نکل گئے ہیں جانے کتنے خواب

پہلے آنکھیں نیند سے بوجھل بوجھل رہتی تھیں
اب آنکھوں میں ڈر آتے ہیں چپکے چپکے خواب

ایسا لگتا ہے وہ ہم کو یک سر بھول گئے
اب تو سب کافور ہوئے ہیں میٹھے میٹھے خواب

ہم نے اپنے ہاتھ سے لکھی خوابوں کی تعبیر
جانے کیوں پھر ہاتھ سے اپنے آپ مٹائے خواب

آنکھوں سے نیندلے گیا تنہائیوں کا دُکھ
الفاظ بن کے شعروں میں ڈھلتے تھے میرے خواب

دامن مِلا نہ کوئی تو مٹی میں مِل گئے
آنکھوں سے اشک بن کے جو گرتے تھے میرے خواب

دھرتی یہ، میرے خواب کی تعبیر تھی ندیم
جلتے تھے میرے شہر تو جلتے تھے میرے خواب

ریاض ندیم نیازی

اُس نے دھرتی پر بھیجے ہیں، آنکھیں، چہرے، خواب
بھیگی راتوں میں ٹپکے ہیں، آنکھیں، چہرے، خواب

جب سے میں نے اُس سے کیا ہے چاہت کا اظہار
بدلے بدلے سے لگتے ہیں ہیں، آنکھیں، چہرے، خواب

لینے والوں کی مرضی ہے، جس کو چاہے لیں
بازاروں میں سجے ہوئے ہیں، آنکھیں، چہرے، خواب

اپنی اپنی منزل اُن کی اپنی اپنی راہ
جانے کب سے بھاگ رہے ہیں، آنکھیں، چہرے، خواب

لوحِ دل پر نقش ہوئے ہیں سارے نقش ندیم
مجھ کو اکثر یاد آتے ہیں، آنکھیں، چہرے، خواب

غزلیں

محبت کا شجر بھی بے ثمر تھا
یہی دکھ تھا کہ جو دردِ جگر تھا

مری جیبوں میں سکّے بولتے تھے
مری باتوں میں ورنہ کب اثر تھا

میسر ہجر میں تھا وصل کا لطف
کسی کی یاد سے یوں بہرہ ور تھا

فضائے کوچۂ دل ماتمی تھی
مکینِ دل، کہ دل سے باخبر تھا

اُسے گوشہ نشینی راس ہے اب
کسی کے عشق میں جو دربدر تھا

نقیبِ منزلِ نَو، منزلیں تھیں
سفر کے خاتمے پر، پھر سفر تھا

ہوا معلوم شوکتؔ دل گنوا کر
کہ یہ پتھر، اساسِ بحر و بر تھا

شوکت محمود شوکت

جو عاشق، تری بزم تک جاتے ہیں
دلوں میں وہ لے کر کسک جاتے ہیں

بُرا ان کا ہرگز نہ ساقی منا
نئے بادہ کش ہیں، بہک جاتے ہیں

محبت کے رستے کٹھن ہیں بہت
چلیں ان پہ جو بھی، وہ تھک جاتے ہیں

اٹک جانا، اتنا بھی آساں نہیں
اٹک جاتے جاتے، اٹک جاتے ہیں

گدایانِ شہرِ نگاراں پہ جب
کرم کی نظر ہو، چمک جاتے ہیں

سزاوارِ تعزیر ہرگز، نہیں
یہ اہلِ جنوں کچھ بھی بک جاتے ہیں

غزل

دن اذیت میں گو کٹا ہے مرا
غم حقیقت میں دوسرا ہے مرا

بھید کون و مکاں کے کھولتا ہے
جامِ جم جیسا آئینہ ہے مرا

کچھ زمینوں پہ ہی نہیں موقوف
کہکشاں پر بھی نقشِ پا ہے مرا

چاند سورج مرے خلاف ہوئے
جب سے جلنے لگا دیا ہے مرا

لفظ خوں سے کشید کرتا ہوں
شعر اِس واسطے کھرا ہے مرا

دِن کی وادی میں جا کے اُتروں گا
شب کے اِس پار قافلہ ہے مرا

میری شہ رگ سے بھی قریب ہے وہ
اِس قدر رب سے فاصلہ ہے مرا

ایک دریا کو پار کر کے بھی
ایک صحرا سے سامنا ہے مرا

آنکھ کے راستے سے دل میں اُتر
بالکل آسان سا پتا ہے مرا

میری منزل بھی کھو گئی اشرفؔ
اور رستہ بھی لاپتا ہے مرا

اشرف نقوی

غزل

اے میرے جذب الفت زندگی بھر
رہے گی تجھ سے نفرت زندگی بھر

تری فرقت میں جو ابتر ہوئی ہے
نہیں سدھرے گی حالت زندگی بھر

لبوں پر اب تمہارے ہوگا شاید
فقط ہائے محبت زندگی بھر

مجھے لگتا ہے کرنی ہوگی مجھ کو
اب اشکوں کی تجارت زندگی بھر

میں کھو جاؤں گا اب تاریکیوں میں
نہیں دیکھو گے صورت زندگی بھر

زمیں پر پیر ہوں اور آسماں چھو
تو پاتا رہ وہ رفعت زندگی بھر

جو ہم نے آپ کا دل ہے دکھایا
رہے گی یہ ندامت زندگی بھر

نہیں نکلے گی میرے دل سے شاید
تری اے جان چاہت زندگی بھر

مہینوں میں جو رب نے مجھ کو بخشی
نہیں ملتی وہ شہرت زندگی بھر

جو سورج کی رمق میں نے ہے کم کی
رکھے گا وہ رقابت زندگی بھر

نہیں ہوتی ہے نظروں سے گرے کی
ابھرنے والی قسمت زندگی بھر

ذکی طارق

غزلیں

غم کا دھارا ہوں اور تمھارا ہوں
اشک پارہ ہوں اور تمھارا ہوں

تم نظر بھی ہو تم ہی ناظر بھی
میں نظارا ہوں اور تمہارا ہوں

تم سمندر ہو اور جو سبھی کا ہے
میں کنارا ہوں اور تمہارا ہوں

تم منافع ہو پر کسی کا ہو
میں خسارا ہوں اور تمہارا ہوں

تم مرے ہو مگر میرے نہ ہوئے
میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہوں

محمد سلیم ساگر

وجہِ وجود عشق ہے وجہِ حیات عشق
اصلِ درود عشق ہے اصلِ صلوٰۃ عشق

تن کا نصاب اور ہے من کا نصاب اور
تن کی زکوٰۃ صوم ہے من کی زکوٰۃ عشق

سر پر فلک ہے عشق کا نیچے زمین عشق
میں خود فضائے عشق، مری کائنات عشق

میری فنا فنا نہیں وہ مرگ ہو کہ نیست
ہے دردِ دل میری بقا میرا ثبات عشق

دل میں سرور عشق ہے آنکھوں میں نور عشق
سر میں وفور عشق ہے میری حیات عشق

بحرِ رجز میں لکھوں کہ بحرِ خفیف میں
میری غزل وفا ہے مری حمد و نعت عشق

شورِ شعورِ ذات ہے وجہِ غرورِ ذات عشق
میں آپ ذاتِ عشق ہوں اور میری ذات عشق

غزل

تری کشش کے کلیشے کو توڑنا پڑ جائے
زمیں پہ تازہ روایت کی ابتدا پڑ جائے

سرائے شب میں نہ آئے کسی بدن پہ یہ وقت
کہ اُس کے سائے کو کھڑکی سے کودنا پڑ جائے

ہمارے خوف کا جنگل سے ہو گزر کسی رات
ہمارے خوف کے پیچھے کوئی بلا پڑ جائے

کسی کے نام لکھیں زندگی کا آخری شعر
وہ شعر آخری لمحوں میں کاٹنا پڑ جائے

ہمارے شعلے پہ شعلہ گرے تو خیر ہے دوست!
ہمارے شعلے پہ چھینٹا نہ آپ کا پڑ جائے

بنا کے راہِ فرار اپنے پاس رکھ لی ہے
نہ جانے کون سی منزل سے بھاگنا پڑ جائے

شاہد ماکلی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری بات کہنے رہنا ، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علم فرو نہ کرنا ، یہ فلک سجائے رکھنا

غزل

میں لخت لخت خود کو بچانے میں لگ گیا
ہو کر زمانہ ساز زمانے میں لگ گیا

اپنی کسی تلاش میں میرا وجود بھی
اک آئینہ تھا آئینہ خانے میں لگ گیا

جو چھاؤں کو تراشنے نکلا تھا دشت میں
وہ نخلِ سایہ دار گرانے میں لگ گیا

آنکھوں سے کیا بہاؤں تری یاد کا لہو
خونِ جگر تو تیرے فسانے میں لگ گیا

جو کچھ نیا کہا وہ نیا پھر نہیں رہا
کارِ ہنر تو یوں ہی دکھانے میں لگ گیا

جب سے کلام میر کے کھلنے لگے رموز
صدیوں کا بار مصرع اُٹھانے میں لگ گیا

پھر یوں ہُوا کہ عمر مری کٹ گئی تمام
مجھ کو جو وقت تجھ کو بُلانے میں لگ گیا

اپنے ہی ناخنوں سے تو کھودی تھی اپنی قبر
خود ہی میں اپنا سوگ منانے میں لگ گیا

جس کو کسی بھی درد سے نسبت نہ تھی ذرا
دیکھا کہ وہ بھی اشک بہانے میں لگ گیا

مجھ سے کوئی بھی چیز سنواری نہ جا سکی
یوں ہی میں اپنا آپ بنانے میں لگ گیا

بس رہ گئی وہ دل میں تمنا کہ جو بھی تھی
وہ مجھ کو اپنا حال سُنانے میں لگ گیا

خفت کہاں کہ دل کا عجب تجربہ رہا
ہونے لگی خلش تو مٹانے میں لگ گیا

مجھ پر عیاں ہوئے تھے حقیقت کے راز کیا؟
دل سی عزیز شے بھی لُٹانے میں لگ گیا

تعمیر سے غرض تھی نہ تعبیر ہی سے کام
خود کو سہانے خواب دکھانے میں لگ گیا

پاس اپنے ون سا کوئی ایسا خزانہ تھا!
جو کچھ بچا کھچا تھا لُٹانے میں لگ گیا

اتنا زیادہ وقت کہاں سوچنے کا تھا
وہ وقت تیرے ساتھ جو جانے میں لگ گیا

کوئی خود اپنے قد میں اُبھرتا تو کس طرح!
ہر ایک، دوسرے کو بلانے میں لگ گیا

دنیا بھی اِک تراب تھی میں بھی تراب تھا
میں بھولپن میں دنیا بنانے میں لگ گیا

اپنے ہُنر میں جی تو رہا ہوں مگر نبیل
لیکن منہ مجھ کو بُھلانے میں لگ گیا

نبیل احمد نبیل

غزلیں

وہ جن کے نقشِ قدم کہکشاں سے ملتے ہیں
سراغ ان کے اسی خاکداں سے ملتے ہیں

کرے گی صرفِ نظر کربلا سے کیا تاریخ
کچھ آفتاب صفت ضوفشاں سے ملتے ہیں

چلو یہ رمز تو دنیا پر آشکار ہوئی
کہ کچھ کمال فقط نقدِ جاں سے ملتے ہیں

جڑی ہوئی ہے سحر انتہائے ظلمت سے
یقیں کے سلسلے جیسے گماں سے ملتے ہیں

گناہگار سے نفرت کبھی نہیں کرتے
کم ایسے لوگ صفِ زاہداں سے ملتے ہیں

یہ اور بات کہ تفہیم کر نہیں سکتے
اشارے یوں تو ہمیں آسماں سے ملتے ہیں

گناہ لگتا ہے اکثر ہمیں یہ کارِ ثواب
ہنسی خوشی سے جب آزردگاں سے ملتے ہیں

قدیم دور میں دل کا بسیرا ہے جاذب
پر اپنے خواب تو آئندگاں سے ملتے ہیں

اکرم جاذب

آنکھیں ہوں اور کوئی خواب نہ ہو
اس طرح زندگی عذاب نہ ہو

غیر ممکن ہے سامنے اس کے
آئنہ رشکِ ماہتاب نہ ہو

میری سانسوں میں آ بسی ہے جو
کیا خبر نکہتِ گلاب نہ ہو

جیسے سیپی میں موتی ہوتا ہے
حسن ہو اور بے حجاب نہ ہو

رب سے شکوہ نہیں کروں گا میں
اک دعا بھی جو مستجاب نہ ہو

کیسے ممکن ہے آنکھ دیکھے ظلم
دل شاعر میں اضطراب نہ ہو

کون انصاف کو کہے شفاف
محتسب کا جو احتساب نہ ہو

سوچ کر کانپ جاتا ہوں جاذب
یعنی یہ پیار بھی سراب نہ ہو

غزل

کیسی پہچان ہے پہچان سے خوف آتا ہے
یعنی انسان کو انسان سے خوف آتا ہے

اب کہ کافر کا مسلمان سے ڈرنا کیسا
اب مسلماں کو مسلمان سے خوف آتا ہے

اہلِ ایمان سے ملتا ہوں تو ان کے دل میں
ایسا ایماں ہے کہ ایمان سے خوف آتا ہے

ہر طرف پھیل چکا عالمِ نفسی نفسی
ہر پریشاں کو پریشان سے خوف آتا ہے

جو ترے میز پہ رکھا ہے یہ دائیں جانب
منصفا اس ترے میزان سے خوف آتا ہے

وہ جہاں چاہے وہاں آگ لگا دیتا ہے
شہر کے شہر کو سلطان سے خوف آتا ہے

جانے کیا کب نکل آئے جو ہمارا ہی نہ ہو
گھر میں رکھے ہوئے سامان سے خوف آتا ہے

صبح سے شام تلک شام سے پھر صبح تلک
چور تو چور ہیں دربان سے خوف آتا ہے

صغیر احمد صغیر

غزل

ذرا سی دیر لگی تھی معاف کرتے ہوئے
مگر زمانے لگے دل کو صاف کرتے ہوئے

وہ کہہ رہی تھی کہ اب اس کو مجھ سے پیار نہیں
جھکی جھکی تھی نظر انکشاف کرتے ہوئے

میں مسکرا کے نہ کہتا جو "کوئی بات نہیں"
تو مر ہی جاتا کوئی اعتراف کرتے ہوئے

مگر یہ ترک تعلق تھی اس کی مجبوری
خود اپنی ذات سے بھی اختلاف کرتے ہوئے

اور ایک میں ہوں کہ قائم ہوں بات پر اب بھی
زمانے بھر کو خود اپنے خلاف کرتے ہوئے

میں دور ہی سے نگاہوں سے چومتا ہوں اسے
قریب جا نہ سکوں گر طواف کرتے ہوئے

میں چاہتا ہوں کہ بس اب اسی کو یاد رکھوں
اسی کو یاد کروں، اعتکاف کرتے ہوئے

کہیں اسی کی گلی میں نہ پھر چلا جاؤں
ہر اک اصول سے میں انحراف کرتے ہوئے

یہ سرد مہری کے دن ہیں، گزارنے دے میاں
کسی کی یاد کو اپنا لحاف کرتے ہوئے

ہے موج زن کوئی دریا سا میرے سینے میں
نکل پڑے نہ کسی دن شگاف کرتے ہوئے

علمدار حسین

غزلیں

رنگ میں ڈوبی ہوئی یہ روشنی اپنی جگہ
روشنی پہ وار کرتی تیرگی اپنی جگہ
ایک ہی زندان میں قیدی ہیں دونوں ہر گھڑی
زندگی اپنی جگہ ہے خودکشی اپنی جگہ
ہنستے ہنستے رو پڑے ہم الوداع کہتے ہوئے
حوصلہ اپنی جگہ ہے بے بسی اپنی جگہ
ایک ہے بازار میں اور ایک اپنی شاخ پر
پھول ہے اپنی جگہ پر اور کلی اپنی جگہ
دوسروں سے پیار کرنا بھی کوئی کم تو نہیں
خالقِ ارض و سما کی بندگی اپنی جگہ
کون جانے کتنی باتیں ان کہی رہ جائیں گی
گیت غزلیں اور میری شاعری اپنی جگہ

افتخار شاہد

اے چارہ گرو تم سے گلہ کچھ بھی نہیں ہے
اس درد کی دنیا میں دوا کچھ بھی نہیں ہے

ہم آج کسی دشت میں کل شہر میں ہوں گے
ہم خانہ بدوشوں کا پتا کچھ بھی نہیں ہے

اک عمر اسی خبط میں گزری ہے ہماری
محبوب کی آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

اترے جو سرِ بام ترے حسن کا سورج
پھر چاند ہو جگنو یا دیا کچھ بھی نہیں ہے

ان میں کوئی جام میرے کام کا لگتا نہیں
اچھے کوزہ گر تری کوزہ گری اپنی جگہ
کاروبار زندگی بھی چھوڑنا ممکن نہیں
یار تیرا پیار تیری دوستی اپنی جگہ
آپ جس انداز سے اترے ہیں بامِ شوق پر
مبتلا اپنی جگہ ہیں حیرتی اپنی جگہ
یوں تو شاہد زندگی میں اور بھی خوشیاں ملیں
تیرے ملنے کی مگر وہ اک گھڑی اپنی جگہ

ہم لوگ تمناؤں کی سیڑھی سے گرے ہیں
اور لوگ یہ کہتے ہیں ہُوا کچھ بھی نہیں ہے

شاہد یہ کھلا دشت نوردی کی بدولت
صدیوں کی ریاضت کا صلہ کچھ بھی نہیں ہے

غزل

ایک خلقت ساتھ ہے طرّہ سلامت دیکھ کر
کون ٹھہرے گا مگر سر پر قیامت دیکھ کر

آئینے بھی رو پڑے ہیں آئینہ گر کی طرح
ہر رُخ تعبیر پر زخمِ ملامت دیکھ کر

ساری دانائی دھری رہ جائے گی دہلیز پر
عظمتیں آئیں گی گھر کا قد و قامت دیکھ کر

رات کی تعزیر کیا زنجیر کر پائے ہمیں
دل ٹھہرتا ہی نہیں دن کی علامت دیکھ کر

زلزلہ زیرِ زمیں کروٹ بدل کر رہ گیا
شہر کے دیوار و در کی استقامت دیکھ کر

اپنے اندر ریزہ ریزہ ہوں میں اس کے روبرو
مطمئن ہے وہ مگر چہرہ سلامت دیکھ کر

عین تاریکی میں یہ کیسی شفق کھلنے لگی
شب ہراساں ہے ترے خوں کی کرامت دیکھ کر

روشن اپنی مصلحت کیشی کہاں لائی مجھے
آئینے میں اپنے خال و خد سلامت دیکھ کر

اعجاز روشن

غزل

کیسے کروں میں دِل کی بات
ہوتی نہیں اب جلدی بات

اُس سے بچھڑے عمر ہوئی
لگتی ہے یہ کل کی بات

نام اُسکا جب لیتا ہوں
کرتا ہے وُہ میری بات

اب وُہ دور نہیں باقی
کیسا قصہء کیسی بات

خاموشی کا پہرہ ہے
کہی نہ جائے دِل کی بات

لاکھ چھپا کر رکھی تھی
دِل میں کب تک رہتی بات

برقِ زمانہ میں جل کر
اب سہتے ہو کس کی بات

راز ہوا کے ہاتھ نہ دو
گھر میں رکھو گھر کی بات

سامنا اُنکا جب بھی ہوا
جی میں رہ گئی جی کی بات

نام لیا جب اس کا تو
کہنے لگے ، ہے کس کی بات

ہونٹ مِرے خاموش رہے
اُس نے مجھ سے چھینی بات

اُس کے گوش گذار رہی
ہونٹوں سے جب سرکی بات

کون تمھارا ہمدم ہے
ہے تاثیر نہ کس کی بات

تاثیر نقوی

غزلیں

تمہیں پسند ہے کیا اور کیا پسند نہیں
ہمیں تو کچھ بھی تمہارے سوا پسند نہیں
ہوا چھو جائے تمہیں تو ہوا پسند نہیں
تمہیں جو دیکھے ہمیں آئینہ پسند نہیں
تمہی کو چاہتے ہیں ہم تمہی کو چاہیں گے
تمہارے جیسا کوئی دوسرا پسند نہیں
تمہیں جو کہنا ہے وہ صاف صاف کہہ ڈالو
میں معتدل ہوں کوئی انتہا پسند نہیں
بھلا کیوں آتے ہی جانے کی بات کرتے ہو
تمہاری یہ ادا مجھ کو ذرا پسند نہیں

وسیم جبران

آپ کا نام زمانے سے چھپا سکتے ہیں
اور ہم غم کی بھی روداد سنا سکتے ہیں
راہ میں روز ملاقات تو ہو جاتی ہے
آپ چاہیں تو مجھے گھر بھی بلا سکتے ہیں
آپ نے حال جو پوچھا ہے مرا محفل میں
لوگ اس بات کا افسانہ بنا سکتے ہیں
آپ کے ہاتھ میں ہے دل تو کریں جو سو کریں
رکھ بھی سکتے ہیں اسے توڑ کے جا سکتے ہیں
لاکھ تو ہم سے بھلا دینے کے وعدے لے لے
ہم کہاں نقش ترا دل سے مٹا سکتے ہیں

وہ چل پڑا تو اسے الوداع کہنا پڑا
سفر کے وقت ہمیں روکنا پسند نہیں
نگاہِ شوق سے پیغام کوئی مل جائے
یا پھر کہو کہ مرا مدعا پسند نہیں
زباں پہ ہے جو وہی بات دل میں ہے جبران
عمل کوئی بھی ہمیں دوغلا پسند نہیں

آپ کی یاد کسی طور بہل سکتی ہے
گلِ لالہ بھی تو آنگن میں کھلا سکتے ہیں
اب تو یہ طے ہے کہ اب ہم کو بچھڑ جانا ہے
آخری بار سہی ہاتھ ملا سکتے ہیں
مصلحت کا ہے تقاضا ابھی خاموش رہیں
ورنہ جبرانؔ کوئی حشر بھی ڈھا سکتے ہیں

غزل

کام آتا بھی تیرے میں کیا وقت پر
تو نے دی ہی کہاں تھی صدا وقت پر

کشت امید سوکھی رہی دوستا
چاہتوں کی نہ برسی گھٹا وقت پر

جرم رقصاں ہوا ہے مرے دیس میں
کاش ملتی کسی کو سزا وقت پر

موسمِ گُل کی آمد کے آثار ہیں
یار پنچھی کرو تم رہا وقت پر

رقص کرتی رہے گی یہ تیرہ شبی
گر جلایا نہ تم نے دیا وقت پر

اس لیے بھی جدائی مقدر بنی
دے نہ پائے کسی کو صدا وقت پر

روزِ محشر نہ ارشد ندامت رہے
ہو سکے کر لو راضی خدا وقت پر

ارشد محمود ارشد

غزل

دنیا کی دوڑ میں مجھے سبقت نہ مل سکی
خوش ہوں کہ شکل دنیا سے صورت نہ مل سکی

پھولوں کا ہم مزاج تھا سویا نہ رات بھر
کانٹوں کے فرش پر اسے راحت نہ مل سکی

مصروف اس قدر ہوا یہ زیست کا سفر
سانسوں کو اک خیال سے فرصت نہ مل سکی

اس کی ادا میں رنگ تھے اتنے جدا جدا
اس بے وفا سے اپنی طبیعت نہ مل سکی

اے ہجر یار ! دیکھ تیرا امتیاز ہوں
میں وہ ہوں جس کو وصل کی لذت نہ مل سکی

امتیاز گلیانوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رنگوں میں جب تک نہ ملا تھا رنگ حقیقت کا
خاکے خاکے ہی کہلائے ہو نہ سکے تصویر

غزل

اخبار میں جناب کی تصویر دیکھ کر
حیران ہو گیا ہوں یہ تشہیر دیکھ کر

اِک خواب آج دیکھ کے خوش ہوں بہت مگر
ڈر جاؤں مَیں نہ خواب کی تعبیر دیکھ کر

نکلا ہے کاغذوں سے مرے، نامہ یار کا
کیا کیا نہ یاد آ گیا تحریر دیکھ کر

یوں تو مجھے ہیں یاد تری کج ادائیاں
بس آ گیا ہوں مَیں تجھے دِلگیر دیکھ کر

تنکے بھی میری آنکھ کے تم دیکھ لو مگر
آؤ تو اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھ کر

ذہنی غلام ہو کے بھی رہتے ہیں خوش مگر
کھاتے ہیں خوف آہنی زنجیر دیکھ کر

ممکن نہیں ہے جن سے کسی طور ہمسری
کرتے ہیں وہ حسد تری توقیر دیکھ کر

چھوٹی سی ایک بھول کی اتنی بڑی سزا
دیکھو! سزائیں دو ہمیں تقصیر دیکھ کر

مانگے کی روشنی پہ نہ یوں رکھیے حضور!
دھوکا نہ کھایئے کبھی تنویر دیکھ کر

سچ بولنا نہیں کسی صورت روا یہاں
میرے حضور! کیجیے تقریر، دیکھ کر

جَور و ستم عروج پہ لیکن ہیں چُپ سبھی
دل میرا خون روتا ہے کشمیر دیکھ کر

نعرے لگا رہے تھے بڑے اِنقلاب کے
اب ڈر گئے ہو سامنے شمشیر دیکھ کر

کشکول لے کے پھرتے ہیں ہم دربدر سدا
آئے کبھی تو شرم یہ تحقیر دیکھ کر

ٹکڑا ہے اِک زمیں کا، معلّیٰ کہیں جسے
آیا ہوں مَیں حسینؑ کی جاگیر دیکھ کر

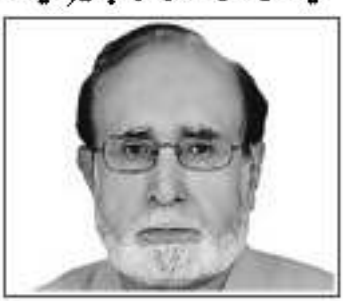

سید ضیا حسین

غزلیں

دانائی کی تاریخ میں انمول رہے ہیں
ہر دور میں ہم صورتِ بہلول رہے ہیں

میزانِ معانی پہ بہت نکتہ وری سے
وہ شاعرِ مضطر کی کتب تول رہے ہیں

اک قمری ءخوش رنگ کی آواز کے پیچھے
ہر قسم کے زاغوں کے کئی غول رہے ہیں

ہم معرکہ ءوہم وگماں میں ہیں ظفریاب
یہ خول اتارا ہے زِرہ کھول رہے ہیں

حیرت ہے کہ مٹی میں کئی لعلِ بدخشاں
یہ کور نظر بیٹھے ہوئے رول رہے ہیں

اسد اعوان

اسد راہِ جنوں میں آبلہ پائی ہوئی ایسی
مری خود سے محبت میں شناسائی ہوئی ایسی

یہ ہنگامہ ءجشنِ مہ جبینانِ کوئے اعدا
ترے شاعر کی جانِ من پزیرائی ہوئی ایسی

سکوتِ ہستی ءدنیائے خوب وزشت کے اندر
نگاہِ ناصحِ دل کی شکیبائی ہوئی ایسی

دنورِ اشتیاقِ وصلِ شب کے ہر فسانے میں
ہماری ذات کی ہر سمت رسوائی ہوئی ایسی

قرینہ ءمحبت سے شناسائی نہ تھی ہم کو
ہماری نوجوانی ہم سے ہرجائی ہوئی ایسی

آنکھوں میں ترے حُسن کے جلوے ہیں زمیں پر
گردوں میں ستاروں کی چمک گھول رہے ہیں

میخواروں نے دیکھا ہے تجھے صورتِ صہبا
میخواروں کے راہوں میں قدم ڈول رہے ہیں

یہ لوگ اسد بہرے ہوئے شہرِ انا کے
یہ لوگ بہت اونچا یہاں بول رہے ہیں

کوئی مجنوں نہیں ہیں ہم مگر مجنوں سے نسبت ہے
طبیعت عشق میں اپنی بھی صحرائی ہوئی ایسی

ملمع کاری ءاندامِ خوبانِ جہاں مت پوچھ
ہجومِ شوق سے موقوف رعنائی ہوئی ایسی

اسد آوازِ شب خیزی ءیاراں کے سبب ہم سے
خفا حجرہَ تنہائی میں ہمسائی ہوئی ایسی

غزل

اب تو سمجھا نہ وہ زبانی تک
یعنی بات آ گئی ہے یعنی تک

راہ میں تیری اور کیا کرتے
چھوڑ دی ہم نے رائیگانی تک

گھڑ لو تاویلیں جس قدر چاہو
سچ نے آنا نہیں کہانی تک

قدم اٹھے نہیں تری جانب
ورنہ ہم نے تو دل میں ٹھانی تک

اس کا ہونا ، نہ ہونا ہو نہ سکا
کر کے دیکھی ہے بدگمانی تک

تنکا تنکا ہی ٹھہری سحر
ہو کے آئے ہیں بیکرانی تک

حسنین سحر

غزل

نکھرا نکھرا چہرا نکھری نکھری دھوپ
جیسے سرما کی ہو پہلی پہلی دھوپ

سورج نے سوتے میں ماتھا چوم لیا
گالوں تک جاگی ہے گوری گوری دھوپ

ہم کو تھی درکار گھٹائیں ساون کی
زلفوں نے ٹپکائی گیلی گیلی دھوپ

اپنی اپنی سمت چلے ہم صحرا میں
ہم نے سر پر اوڑھی اپنی اپنی دھوپ

دل میں سائے کی خواہش بیدار ہوئی
آنکھوں میں چمکی ہے سوئی سوئی دھوپ

کس نے یہ دیوار اٹھائی مشرق میں
آنگن میں آتی تھی اچھی خاصی دھوپ

دوہرے موسم برسے اُس کی یادوں کے
تھوڑی تھوڑی بارش تھوڑی تھوڑی دھوپ

رانا سعید دوشی

غزل

میں نے اپنے آپ کو جب بھی آنکھیں میچ کے دیکھا
خود سے بڑھ کر اک دنیا تھی آنکھیں میچ کے دیکھا

آنکھیں کھول کے دیکھ نہیں سکتے کیا دنیا والے
دنیا نے مجھ کو ہر پل ہی آنکھیں میچ کے دیکھا

کس کس کے پتھر برساتے، زخمی ہاتھ ہوئے ہیں
پھر کس کس نے گل باری کی، آنکھیں میچ کے دیکھا

من میں راگ الاپوں سا، رے، نی، سا، رے، دھا سوچوں
ما، پا، نی، سا، ما، پا، گا، نی آنکھیں میچ کے دیکھا

آنکھیں کھول کے دیکھ رہا تھا سمجھ میں کچھ نہ آیا
بن کرنے کے جو ہے بھرنی، آنکھیں میچ کے دیکھا

میز پہ رکھے کپ سے اڑتی بھاپ نے آنکھیں کھولیں
سوندھی خوشبو والی کافی، آنکھیں میچ کے دیکھا

انیس احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کتنی مشکل سے کوئی لفظ گہر ہوتا ہے
کتنے سینے صدفِ آہ و بکا رہتے ہیں

غزل

احمد جلیل

وہ جس نے کچھ نہیں سوچا دیے بجھاتے ہوئے
قدم قدم پہ گرے گا وہ لڑکھڑاتے ہوئے

وہ میری سمت نہیں دیکھتا ہے بھول کے بھی
میں جس کو دیکھتا رہتا ہوں آتے جاتے ہوئے

اگر وہ دشمنِ جاں ہے تو پھر جواز تھا کیا
مجھے سنبھالتا جاتا تھا کیوں گراتے ہوئے

بلا کی آندھیوں میں بھی رہے ہیں یہ روشن
چراغ پلکوں پہ اب بھی ہیں جھلملاتے ہوئے

محل وہ پیار کا لمحوں میں ہو گیا مسمار
کئی زمانے لگے تھے جسے بناتے ہوئے

وہ جس نے لمحوں میں ہم کو بھلا دیا ہے جلیلؔ
ہمیں زمانے لگیں گے اسے بھلاتے ہوئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

غزل

زندگی زندگی میں ڈھلنے لگی
روشنی ساتھ ساتھ چلنے لگی

رات ٹھہری نہیں ہے رستے میں
وقت کی گرد باد چلنے لگی

اک کہانی ہے خواب کے اندر
غم کی صورت کہیں بہلنے لگی

بوجھ سانسوں نے کم کیا اپنا
چیخ تارِ نفس کو کھلنے لگی

آسمان پر تغیرات کی دُھند
پھر زمیں رُخ کوئی بدلنے لگی

رات کی بے کنار وسعت میں
اک صدا پھر فغاں میں ڈھلنے لگی

دل کو تشکیک سے نکالے کوئی
جان میں بے کلی سنبھلنے لگی

آس پلکیں دھواں دھواں کیوں ہیں
زیست کیوں راستے بدلنے لگی

آسناتھ کنول

غزل

کہاں وہ ہوتا ہے؟ جو کچھ دِکھائی دیتا ہے
ہمارے خواب کا منظر سراب جیسا ہے

کسی کی یاد جلانے کا کام کرتی ہے
کسی کی یاد سے دل کو سکُون مِلتا ہے

کوئی تو بات اُسے مجھ میں اچھی لگتی ہے
وگرنہ کون کسی کا خیال رکھتا ہے؟

غریب کا تو گُزرتا ہے دِن بھی مُشکل سے
اُسے نہ پُوچھ کہ یہ سال کیسے گزرا ہے؟

یہ رُوح جِسم سے نِکلے گی ایک دِن کیفی!
کسی مکان میں کب تک کوئی ٹھہراتا ہے؟

محمود کیفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھول ہیں، تتلیاں ہیں، آنچل ہیں
چار سو، انتشار سا، کچھ ہے

غزل

یہ میرا عشق کوئی طُرفہ تماشا ہی نہ ہو
زندگی جس کو سمجھتا ہوں ، بتاشہ ہی نہ ہو

جو نظر آتا ہے ایسا تو نہیں ہے منظر
سیر بھی جس کا سُنا وزن ، وہ ماشہ ہی نہ ہو

تم جسے زندہ سلامت ہی سمجھتے ہو ابھی
دیکھ لو وہ کہیں ارمان کا لاشہ ہی نہ ہو

اُسے انسان کے عنواں سے پکاریں کیسے؟
جس کی تہذیب وتمدن نہ ہو، بھاشا ہی نہ ہو

جینے والے تو کسی آس پہ جی لیتے ہیں
دل ہے وہ کہ جس میں کوئی آشا ہی نہ ہو

لُطفِ فردا کی اُمیدیں ہی کھلاتی ہیں کنول
لطفِ امروز کہاں ہے جو بُراشا ہی نہ ہو

وہ سراپا تو کسی اور ہی سانچے میں ڈھلے
گر اُسے مَیں نے تصوّر میں تراشا ہی نہ ہو

آفتاب خان

غزلیں

آئے گا پھر نہ لوٹ کر دور بہار بھی گیا
وقت کا جال توڑ کر دل کا قرار بھی گیا

وصل کی جب امید تھی کرتے رہے شمارِ غم
اب وہ امید بھی گئی اب وہ شمار بھی گیا

جس کو سنا کہ ہے وہی ہم نفسِ حبیبِ من
اسکے قدم کو بھی چھوا اسکے دوار بھی گیا

کھو گئی مے کشی لئے رات کی شبنمی ہوا
بادِ صبا سے وقتِ صبح بوس و کنار بھی گیا

سیّد بہت عجیب تھا، تیرے جہان درد میں
غم کا شکار بھی رہا عمر گزار بھی گیا

حسن پرویز سیّد

کبھی بھٹکوں بھی تو مڑتا ہوں دوبارہ تیری سمت
مجھ کو لے جاتا ہے ہر ایک اشارہ تیری سمت

میں تو مجدھار میں ہوں مجھ سے امیدیں نہ لگا
تو نکل جا کہ ہے دریا کا کنارہ تیری سمت

آنکھ تو عقل کی تابع ہے، پلٹ جاتی ہے
دل وہ عاشق، سدا جھکتا ہے بیچارہ تیری سمت

تیرے ملنے کا مجھے وہم و گماں بھی نہیں تھا
مجھ کو لے آیا ہے قسمت کا ستارہ تیری سمت

تو جو مدہوش ہوا اپنے سکوں میں سیّد
یہ عدو پلٹیں گے پھر مار کے نعرہ تیری سمت

غزلیں

جب سے اے یار تیرا سہارا نہیں رہا
اس شہرِ دل میں اپنا گزارا نہیں رہا

ساحل پہ اک ہجوم تھا اور ڈوبتے تھے ہم
لگتا ہے ان میں کوئی ہمارا نہیں رہا

ترکِ تعلق سب سے کیا جس کے واسطے
افسوس اب وہ یار ہمارا نہیں رہا

ہم کو تو اس سے اب بھی محبت ہے بے پناہ
یہ اور بات اب وہ ہمارا نہیں رہا

یاروں کی مشکلوں میں سدا کام آئے ہم
مشکل میں کوئی اپنا سہارا نہیں رہا

دنیا بھری ہے ظلم سے اب کیجئے ظہور
اب بے کسوں کا کوئی سہارا نہیں رہا

اک دور تھا کہ رونقِ خانہ تھے ہم رضا
اب میں کسی کا راج دُلارا نہیں رہا

سید فرخ رضا ترمذی

میرے آنگن میں محبت کا زمانہ رکھ دے
جس میں سب سکھ ہوں کوئی ایسا خزانہ رکھ دے

دم گھٹا جاتا ہے، تو تازہ ہوا بھیج یہاں
حبس موسم میں کوئی پَل تو سہانا رکھ دے

میرا سب کچھ ہے ترے پاس، تہی داماں ہوں
میری دامن میں کوئی خواب پرانا رکھ دے

تجھ کو زیبا ہے عطا کرنا تو سن میری دعا
میرے لمحے میں مرا سارا زمانہ رکھ دے

چھوڑ سکتا نہیں میں حق کی حمایت ہرگز
چاہے تو لا کے مرے سامنے دنیا رکھ دے

جو اندھیروں کو مٹا سکتا ہو آنگن سے مرے
تو مرے گھر میں کوئی ایسا ستارہ رکھ دے

جس سے دل میرا بہل جائے تری فرقت میں
تو میرے سامنے کچھ ایسا بہانہ رکھ دے

تجھ سے اتنی سی طلب تھی کہ تو عزت کرتا
کب یہ چاہا کہ تو قدموں میں خزانہ رکھ دے

غزل

حاصلِ ایمان ، اُلفت یار کی
منزلِ کونین ، چاہت یار کی

ہر کسی پر اب تو پیار آنے لگا
چھا گئی ایسی محبت یار کی

کون ہے اچھا ، بُرا کہئے کسے
سب کی صورت ہے بصورت یار کی

تبصرے اور تجزیئے اپنی جگہ
محور و مرکز ہے نسبت یار کی

کیا موافق، کیا مخالف ،دوستو
حاکمِ اعلیٰ ہے قدرت یار کی

لب کشائی کیجئے گا سوچ کر
کار فرما ہے مشیّت یار کی

چاک دامانی و غمازی غلط
پردہ پوشی ٹھہری عادت یار کی

ایک جنت ،ایک دوزخ بن گئی
دونوں جانب ہے حکومت یار کی

لا کا جلوہ ہو کہ اِلّا کا جمال
ہر ادا ہے خوبصورت یار کی

عقل ہو عشق و ہوس ہو یا جنوں
سب سے بالا تر حقیقت یار کی

کتنے سورج ایک ذرّے میں نہاں
کتنے رنگوں میں ہے نکہت یار کی

مطلعِ آفاق ، دُوری کا گماں
شاہ رگ ، انفاس ، قربت یار کی

حال و ماضی ہو کہ استقبال ہو
سب میں ہے فیضانؔ فطرت یار کی

فیض رسول فیضان

غزل

تیرگی میں ثبات بن جاؤں
روشنی کی حیات بن جاؤں

زیست لپٹی ہوئی ہے رستے میں
سانس کا التفات بن جاؤں

اب میں حیران ہی نہیں ہوتا
دن میں پھیلوں تو رات بن جاؤں

دیکھ کر بازگشت سوچوں کی
ذات میں تیری ذات بن جاؤں

اے محبت ، مرا وجود ، ترا
تیرے دم سے میں ذات بن جاؤں

فیض پہنچے مرا زمانے کو
میں ضیا بار ہاتھ بن جاؤں

درد مجبور کر رہا ہے شفیق
مسکراتی حیات بن جاؤں

محمد شفیق انصاری

غزلیں

کوئی فرار کی صُورت بنا نہیں پائے
تمہاری یاد کو دِل سے بُھلا نہیں پائے

بھڑک رہا ہے ابھی تک تری طلب کا چراغ
بلا کے جھونکے بھی اِس کو بجھا نہیں پائے

بھری ہُوئی ہیں کمانیں اگرچہ تیروں سے
عدو پہ ٹھیک نشانے لگا نہیں پائے

تمام زخم گزشتہ کے بھر گئے پھر بھی
ذرا بھی کھل کے کبھی مُسکرا نہیں پائے

کسی طرف کے بھی آوازے خواب غفلت سے
میں چُپ ہُوا تو جہاں کو جگا نہیں پائے

وہ جس کے واسطے غزلیں کہیں سدا قائل
ہم ایک شعر بھی اُس کو سُنا نہیں پائے

عمر قیاز قائل

بچھڑ گئے ہیں سبھی ہمسفر تو غم کیسا
جو دِل ہُوا مرا زیر و زبر تو غم کیسا

مرے نصیب کی کشتی کو ڈُوب جانا تھا
ہر ایک موج بنی ہے بھنور تو غم کیسا

مرے لیے کبھی دُکھ بھی اُٹھائے تھے اُس نے
ہُوا ہے دُشمنِ جاں اَب اگر تو غم کیسا

جُنوں کا راستہ دُشوار تر رہا ہے سدا
کٹھن اگرچہ ہُوا ہے سفر تو غم کیسا

سیاہ رات میں ہم جل بجھے غنیمت ہے
ملی اگر نہ مرادِ سحَر تو غم کیسا

ہُوئی ہے سنگ زَنی کُوئے یار میں، قائل
جو پاش پاش ہُوا ہے جِگر تو غم کیسا

غزل

نہیں کہ آج ہی دھڑکن میں اضطراب کیا
دلِ خراب نے اکثر بہت خراب کیا

گزرتے لمحے کو پروا کسی کی بھی نہ رہی
کہ کون ساتھ چلا ، کس نے اجتناب کیا

ترے علاوہ بھی کچھ لوگ دل لبھاتے رہے
مری نظر نے مگر تیرا انتخاب کیا

اُٹھا کے راہ کا پتھر بنا لیا ہے گہر
بچھا ملا ہے جو کانٹا اُسے گلاب کیا

نظر میں پھرتی رہی بوند بوند پانی کی
چمکتی ریت نے ہر ذرّے کو سراب کیا

سوال پر ہی سوال اِک اُٹھا دیا ہے امر
جواب بھی نہ دیا اور لاجواب کیا

امر مہکی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کر لیا خون میں تخیل مجھے تم نے تو
تم نے تو روپ بھی فنکار کا بھرنے نہ دیا

غزل

دور تک گہرا خلاء ہے دل کے اندر
زور سے آنسو گرا ہے دل کے اندر

دھڑکنیں گریہ ماتم میں ہیں مصروف
کوئی دلبر سا مرا ہے دل کے اندر

زخم کیسا ہے ، کہاں ہے ، نہیں معلوم!
ایک خنجر سا گڑا ہے دل کے اندر

یاد ، آنسو اور لرزاں سی شبیہیں
بس یہ ملبہ ہی ملا ہے دل کے اندر

ہم نہ بک جائیں غلط داموں سرِ شام
یہی خدشہ سا چھپا ہے دل کے اندر

یہ تو بابر کو پتہ تھا نہ ملے گا
کاش دل کو نہ چھپاتا دل کے اندر

احمد سجاد بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پختہ گھروں کے درمیاں کٹیا اُسارے کس طرح
آخر تری بستی میں دن کوئی گزارے کس طرح

غزلیں

کسی بھی فرد کی پیشانی داغدار نہیں
ابھی یہ لوگ محبت کے زیرِ بار نہیں

میں سوچتا ہوں اسے کس طرح مبارک دوں
جہاں لٹا کے بھی جو شخص سوگوار نہیں

عجیب دکھ ہے یہ دیوانے کس طرف جائیں
فضائے دشت بھی وحشت کو سازگار نہیں

کسی کو خاک ملیں گے نشاں ہمارے جب
ہماری ذات کسی پر بھی آشکار نہیں

کبھی کبھی تو ہمیں دل سے خوف آتا ہے
عجیب دل ہے محبت میں بے قرار نہیں

ہیں مبتلائے غمِ روزگار بھی ہم لوگ
ہمارا صرف محبت پہ انحصار نہیں

محمد علی ایاز

دیکھ کر اس کا مکاں حیرانی میں
اس گلی سے گزرا میں جولانی میں

یہ ہماری رہ گزر ہرگز نہیں
ہم زمیں پر آ گئے نادانی میں

ملتا جلتا تھا تری آنکھوں سے وہ
عکس تھا جو چاند کا اس پانی میں

زندگی کا لطف ہیں دشواریاں
رکھا ہی کیا ہے بھلا آسانی میں

دیکھ کر تصویر اس کی، آج میں
کھو گیا تھا عالمِ ویرانی میں

رات تھی اور آسماں خاموش تھا
ہم ملے تھے چاند کی نگرانی میں

مہر علی

غزل

نہ جانے کیا دکھ تھا اسکو جو وہ ہنسی میں اپنی چھپا رہا تھا
گزر رہا تھا وہ کس اذیت سے لہجہ اس کا بتا رہا تھا

قریب ہو کے بھی دور تھا وہ نگاہیں مجھ سے چرا رہا تھا
نظر میں اسکی تھی اجنبیت لگا کہ جیسے بھلا رہا تھا

وہ جانتا تھا وہ کھو چکا ہے محبتوں کی گھنیری چھایا
نہ جانے پھر کیوں وہ طاق دل پر دیا وفا کا جلا رہا تھا

میں اسکی آنکھوں سے دیکھتی تھی تمام دنیا وہ جانتا تھا
اسی لئے تو وہ جاتے جاتے تمام پردے ہٹا رہا تھا

نہ اس نے مجھ کو پلٹ کے دیکھا نہ میں نے آواز دی تھی اس کو
انا کے تھے ہم اسیر دونوں کہ فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا

ملال رت کو منانا ہنس کے اسی نے ہی تھا سکھایا ہم کو
وہی تو تھا جو کہ دور جا کر بھی عہد اپنا نبھا رہا تھا

جو اتنے برسوں نبھایا اس نے کمال اِس میں اُسی کا تھا سب
وگرنہ اکثر تو مجھ سے میرا یہ سایا تک بھی خفا رہا تھا

نائلہ راٹھور

غزلیں

کسی حسین پہ نظریں جما کے چائے پی
جو دل کہے تو ذرا مسکرا کے چائے پی
مرے لبوں پہ ابھی تک جمی ہے وہ لذت
کہا جو تم نے لبوں کو ملا کے چائے پی
بھری ہوئی جو صراحی ہے سامنے رکھی
ذرا ذرا سی وہاں سے ملا کے چائے پی
کہا جو چائے کا تو وہ تنگ کے کہنے لگا
مرے لہو کو اگن پر چڑھا کے چائے پی
پلک جھپکتے جو آنکھوں سے دور جاتا ہے
اسے بھی پلکوں پہ جھولا جھلا کے چائے پی
مچل رہی ہے جو مدت سے تیرے سینے میں
اس آرزو کو دروں تو دبا کے چائے پی
بڑے بخیل ہیں تیرے نگر کے لوگ شہاب
جو کہہ رہے ہیں کہ پانی ملا کے چائے پی

شہاب اللہ شہاب

دل جب گھر ہو وحشت کا
پھر کیا ڈر ہو وحشت کا
ساتھ ہو صرف اکیلا پن
اور سفر ہو وحشت کا
اک کھڑکی زندان میں ہو
اک منظر ہو وحشت کا
سبز پرندے ہجر کے ہوں
سرخ شجر ہو وحشت کا
جس پہ نیند بھی آ جائے
اک بستر ہو وحشت کا
آنکھ کو اشک بہانے ہیں
خواب نگر ہو وحشت کا
دفن جہاں پہ یادیں ہوں
ایک کھنڈر ہو وحشت کا

عالمگیر ہراج

غزل

چسے ہو پوچھنا، پوچھے نہیں کہ کیا دُکھ ہے
ہر ایک دکھ سے مِرے دوست یہ بڑا دُکھ ہے

میں جانتا ہوں کہ دُکھ بھی ابھی مزہ دے گا
نئی نئی ہے محبت ، نیا نیا دُکھ ہے

مری خوشی میں تو شامل، مری دعاؤں میں تو
ترا جو دکھ ہے مری جان! وہ مرا دُکھ ہے

خوشی کے وقت عزیزوں کا منہ بنا لینا
اُداس لمحوں میں یاروں کا قہقہہ دُکھ ہے

نہیں ہُوا مرے اجداد میں کوئی شاعر
اگر نہ میں بھی ہوا شعر گو تو کیا دُکھ ہے

اب اس جہان میں کیسے کوئی رہے انجم
جہاں پہ کم ہے خوشی اور بے بہا دُکھ ہے

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچّی عمر کا دَھن ہیں سپنے
اِک کھٹکے سے ٹوٹ نہ جائیں

غزل

اسے سانسوں میں ضم کرنا پڑے گا
وگرنہ رنج و غم کرنا پڑے گا

زمیں پر عارضی ہے یہ پڑاؤ
سفر سوئے عدم کرنا پڑے گا

محبت باعثِ قربِ خدا ہے
درونِ دل رقم کرنا پڑے گا

یہ دل وہ حکمراں ہے جس کے آگے
سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا

نہیں مشکل خزاں میں پھول کھلنا
ذرا پلکوں کو نم کرنا پڑے گا

میں سچ بولوں تو کہتے ہیں وہ ساحلؔ
تمھارا سر قلم کرنا پڑے گا

ارسلان ساحل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیٹھے ہیں دل میں خنجرِ حالات گھونپ کر
مظلوم تھے مگر بڑے سفّاک ہو گئے

غزلیں

تا ڈھونڈا اُن کی بزم میں کوئی سا اک مقام
ساقی کو کب دوام ہے، مے کو ہے بس دوام

اے حسنِ کائنات کی دلکش حسیں پری
کچھ تو بتایئے گا کہ کیا آپ کا ہے نام

اس مے کو ہم نے پی کے ہے اکسیر پا لیا
کہتے ہیں لوگ پینا پلانا ہے سب حرام

سب ظرف اپنی حد سے برابر اچھل پڑے
میں نے کہا تھا اُن سے کہ بازو کو میرے تھام

پھر یوں ہوا کہ قیس نے لیلیٰ کی جان لی
عثمان یہ بہت ہی عجب سا ہے اختتام

کچھ اضافہ ء حادثات ہو جائے
آج تھوڑی سی بات ہو جائے

کیوں ہے مقبول اُن کی ہر عادت
کچھ تو اُن کو بھی مات ہو جائے

کچھ لکیریں بنانے مَیں بیٹھوں
اور تخلیق ، کائنات ہو جائے

مجھ کو مل جائے زندگی تھوڑی
ان سے گر کوئی بات ہو جائے

عشق کا تو بس ایک فتویٰ ہے
غم، اصولِ حیات ہو جائے

عثمان حنیف

ہر قدم نیم تنوں ، نیم سروں کا ماتم
ہر نفس سیم تنوں ، سیم بروں کا رونا

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

غزل

ہنر کو آزمانا چاہتا ہے
مجھے مجھ سے لڑانا چاہتا ہے

کمی کوئی نظر آنے لگی ہے
نئی دنیا بنانا چاہتا ہے

بچھڑنا چاہتا ہے مجھ سے لیکن
بچھڑنے کا بہانا چاہتا ہے

غم و اندوہ کی بستی میں رہ کر
وہ پاگل مسکرانا چاہتا ہے

اکیلے پن سے وہ خائف ہے شاید
مجھے واپس بلانا چاہتا ہے

اجازت کوچ کی چاہے کہ اب وہ
نئے دل میں ٹھکانا چاہتا ہے

فقط اک حور کی خاطر وہاں پر
یہاں بستی جلانا چاہتا ہے

وہ ظالم روند کر اپنی زمیں کو
فلک سر پر اُٹھانا چاہتا ہے

ارادہ خودکشی کا کر لیا ہے
مجھے دل سے بھلانا چاہتا ہے

بہت ناخوش ہے اپنی "کُن" سے وہ بھی
سو چاک الٹا گھمانا چاہتا ہے

عطؔا کیسا ہے اُس کو چاہنا بھی
جسے سارا زمانہ چاہتا ہے

عطاالعزیز

غزل

اِک غزل اُس کے نام ہو جائے
بس قلم کا سلام ہو جائے

کاش بن جاؤں میں نقاب اُس کا
رُخ حسیں پر قیام ہو جائے

صُبح رُخسار پر ہو میری طُلوع
اُس کی پلکوں میں شام ہو جائے

اُس کے ماتھے پہ دن چڑھے میرا
وہیں سورج کا کام ہو جائے

جھکی پلکوں کی مہربانی ہے
جب اُٹھے آنکھ، جام ہو جائے

کتنی شِدّت کے لفظ ہوتے ہیں
جب نِگہ ہمکلام ہو جائے

میں ہوں آوارہ ، نیند کی مانند
آنکھ کوئی مقام ہو جائے

مرتضیٰ! اُس کو تکتے تکتے ہی
عُمر میری تمام ہو جائے

غلام مرتضی

غزل

رخسانہ سمن

ہم جیسے چراغوں کے سدا ساتھ رہیں گے
تا عمر محبت کی وہ سوغات رہیں گے

ممکن ہی نہیں گردشِ حالات میں آؤں
جب تک میرے ہاتھوں میں ترے ہاتھ رہیں گے

وہ چھوڑ کے جانے کا مجھے کہنے لگے ہیں
تھی جن سے توقع کہ سدا ساتھ رہیں ہیں

تو جن کے لیے چھوڑ رہا ہے مجھے سن لے
کب ساتھ ترے لوگ یہ کم ذات رہیں گے

کس طرح گزاریں گے شبِ وصل بتاؤ
وہ جن کو بچھڑنے کے بھی خدشات رہیں گے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دھوپ کی ، ریت کی ، تنہائی کی ، ویرانی کی
ہم نے اک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

غزلیں

بہر سو پیڑ اگاؤ ، اداس موسم ہے
زمیں کا حُسن بڑھاؤ اداس موسم ہے

اتر نہ جائے کہیں روح میں یہ سناٹا
کوئی غزل ہی سناؤ اداس موسم ہے

گلاب رنگ کو لگ جائیں چار چاند، اے دوست
کہ تم پہن کے جو آؤ، اداس موسم ہے

فضا میں پھیل رہا ہے یہ روح سوز سکوت
خدارا ہونٹ ہلاؤ اداس موسم ہے

کہاں ہیں؟ دشت نوردی کا جن کو شوق رہا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ اداس موسم ہے

کوئے عناد میں لازم ہوا ہے اب شانی
چراغِ عشق جلاؤ اداس موسم ہے

محسن رضا شانی

حسد کی آگ میں جلتا ہوا دھواں ہونا
فلک نشیں کا اچانک سے خاک داں ہونا

شروع دن سے تعین رہا مجھے صف کا
مجھے گوارا نہیں تھا یہاں وہاں ہونا

یہ خیر خواہی مری جان ہی نہ لے جائے
یوں شاہ زادی کا خادم پہ مہرباں ہونا

پہنچ رہی ہے ہماری پکار اُس در تک
یہی بہت ہے ہمارا اُدھر نشاں ہونا

درِ فقیر پہ بولا نہیں گیا اُس سے
بزعمِ خود تھا جسے صاحبِ زباں ہونا

شعیب عدن

غزل

خُشک ہونے لگے سبُو آ جا
اور یہ آنکھ ہے لہو آ جا

زخم ناسور بن نہ جائیں کہیں
اِن کو کرنے کبھی رفو آ جا

آخری ہے یقیں کی منزل تُو
چھپ نہ ایسے میں روبرو آ جا

اس سے پہلے کہ بھانپ کر دوری
چال چل دے کوئی عدو آ جا

ہے ادھوری سی بات آنکھوں میں
ختم کرتے ہیں گفتگو آ جا

آخری رسمِ رخصتی ہے مری
مقتدی کر چکے وضو آ جا

ردا حاصل خلوص

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ نقش ایک محبت کے عکس تھے خالد
وہ رنگ اب تری تصویر سے نکال دیئے

غزل

صاف انکار بھی نہیں ہوتا
اس سے اقرار بھی نہیں ہوتا

اس میں چاہت بلا کی ہے لیکن
اس سے اظہار بھی نہیں ہوتا

یاں نوازا اسی کو جاتا ہے
جو کہ حق دار بھی نہیں ہوتا

آمنے سامنے کے ہم قائل
چھپ کے تو وار بھی نہیں ہوتا

ماسوا سچ خلوص جذبے کے
دشت بھی پار تو نہیں ہوتا

بات تو سچ ہے یہ تری عاصم
رشتوں کا بار تو نہیں ہوتا

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے ، سو ترے بعد جی لیے

غزلیں

کفارہ ہو سکا نہ ادا جب گناہ کا
میں بھی سراغ پاؤں گی گمنام راہ کا

لازم ہے اپنا آپ کروں میں بھی احتساب
تم بھی سوال پوچھنا دل سے نباہ کا

مشکل کے دن تو خیر گزر جائیں گے ضرور
پوچھا نہیں کسی نے بھی حالِ تباہ کا

غرقاب ہو گئے ہیں گھروندے غریب کے
اس سمت دھیان ہی نہیں عالم پناہ کا

عنبرین خان

اگر یہ ہجر ہی کی داستاں سمٹ نہ سکی
یہ رات کاٹ کے کھا جائے گی جو کٹ نہ سکی

شجر جو بونے تھے آکاس بیل چاٹ گئی
بلند شاخِ صنوبر سے یہ لپٹ نہ سکی

بدن رہا سدا پروازِ فکر میں حائل
چٹان ایسی کہ جو ٹھوکروں سے ہٹ نہ سکی

آفت کی جب بھی کوئی گھڑی آئی دیس پر
کام آیا ہر جوان ہی میری سپاہ کا

مر جائیں گے عوام ہی فتنہ فساد سے
کچھ بھی زیاں نہ ہو گا کسی کج کلاہ کا

مدد ہمیشہ رہے مانگتے غنیم سے ہم
سو مشکلات کے آگے یہ قوم ڈٹ نہ سکی

ہزار دعووں کے باوصف عنبرینؔ یہاں
غریبِ شہر کی کایا کبھی پلٹ نہ سکی

غزل

سمے کے ہاتھ میں ہر ایک فیصلہ دے کر
کہ لوٹ آئی ہوں میں اس کو راستہ دے کر

یہ واقعی ہے محبت کہ عارضی احساس
یہ جاننا ہے کوئی دن کا فاصلہ دے کر

عجیب شخص تھا چہروں کے اژدہام میں بھی
اکیلا رہ گیا لوگوں کو راستہ دے کر

جو آج رو رہا ہے دل کے ٹوٹ جانے پر
وہ ریت توڑے گا اک اور سلسلہ دے کر

سخن کے چاک پہ نغمہ گری کا بار گراں
پھر آئے دشت میں پیروں کو آبلہ دے کر

یہ کائنات کی سب آیتیں تمہاری ہیں
کبھی تو کھول تلاوت کا مرحلہ دے کر

یہ شہر سنگ ہی ہوتا ہے، سنگ کاٹتا ہے
مگر نہال ہے چہروں کو آئینہ دے کر

نہیں یہاں پہ سلامت کسی کی بینائی
یہ لوٹ جائیں گے دنیا کو وسوسہ دے کر

طلب تھی ایک تسلی کی اس کو جان رباب
جو رو پڑا تھا یونہی مجھ کو حوصلہ دے کر

شازیہ رباب

غزل

خسارہ اب نہیں ہوتا
کنارہ اب نہیں ہوتا

تمہیں میں بھول جاؤں پر
خدارا اب نہیں ہوتا

ہوا ہے اس طرح اوجھل
نظارہ اب نہیں ہوتا

تمہیں دیکھے کوئی دوجا
گوارا اب نہیں ہوتا

فلک پر روشنی والا
ستارا اب نہیں ہوتا

اسے اپنا کہوں کیسے
اجارہ اب نہیں ہوتا

الٰہی بھیج دے اس کو
گزارہ اب نہیں ہوتا

رجب علی رجب

غزل

وہ شخص جس نے حد سے گزرنے نہیں دیا
خود سے جدا کیا ہے بچھڑنے نہیں دیا

جب ڈوبنے لگا تو سنبھالا دیا مجھے
اس نے وجود میرا بکھرنے نہیں دیا

اتنا کیا ہے ضبط کہ پتھر کے ہو گئے
آنکھوں سے ایک اشک بھی گرنے نہیں دیا

ہم کو کریدنے کی جو عادت تھی، آج تک
زخمِ جگر کو اس لیے بھرنے نہیں دیا

شاہد سمجھ سے دور تھا نقشہ حیات کا
اور کچھ ہمارا ساتھ سفر نے نہیں دیا

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اک شہر تھا، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

بسم اللہ آٹو الیکٹریشن [افسانچہ]

عاصم بخاری

"صاحب جی نزدیک ہی ایک الیکٹریشن اور آٹو مکینک کی دکان ہے جو شاید اس وقت کھلی ہو باقی تو سبھی سر شام چلے جاتے ہیں۔"

ایک دیہاتی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں اسے بتایا تو وہ شکریہ ادا کر کے آگے بڑھا۔

وہ شام کے بعد اپنی گاڑی پر سفر کر رہا تھا کہ اچانک گاڑی کی بتیاں (لائٹس) بند ہو گئیں۔ جس پر وہ بہت پریشان ہوا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اک دو لوگوں سے مستری کے بارے پوچھا

اندھیرے میں بنا لائٹ سفر کرنا نقصان دہ ہو سکتا تھا سو اس نے گاڑی سائیڈ پر روکی اور اسے لاک کر کے آگے بڑھ گیا۔ دکان کھلی دیکھی تو کچھ جان میں جان آئی۔۔ واقعی وہی ایک دکان دور سے کھلی نظر آئی تھی۔ وہ شکر بجا لایا۔ دکان کے قریب پہنچا تو دکان پر "بسم اللہ آٹو الیکٹریشن" کا بورڈ پڑھا جس کے سرنامے پر ایک آیت بھی پڑھنے کو ملی

"واللہ خیر الرازقین"۔

مستری بھی دکان پر موجود تھا۔ اس نے پوچھا

"جی، فرمائیے کیا خدمت کر سکتا ہوں

پھر گاڑی کی خرابی کا سن کر وہ مجھے اپنی پھٹپھٹی پہ بیٹھا کر چل دیا۔ اس نے الیکٹریشن کو ساتھ آنے کا اشارہ کر دیا تھا

ادھر ادھر سے چیک کرنے کے بعد الیکٹریشن سر ہلاتے ہوئے بولا،

ٹھیک ہو جائے لائٹ، فکر نہ کریں۔ ہمارے تو روز کا کام ہے۔ ہمارا ہاتھ لگتے ہی گاڑی فرفر بول اٹھتی ہے کہ اسے فلاں خرابی ہے۔"

"کتنا خرچہ آ جائے گا؟

"تین ہزار روپے---

تین ہزار---!

یار کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ دن کے وقت یہ تین سو روپے کا بھی کام نہیں۔ ہم مسافر ہیں، ایمرجنسی میں ہیں، جنازے میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں مہربانی کرو"

جنازے میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں یا شادی میں شرکت کے لیے، اگر کام کرنا ہے تو بتاؤ ورنہ کوئی اور الیکٹریشن رات کے اس وقت کام کر کے دیتا ہے تو بھلے شوق سے اس سے کرا لو۔ اسی اثنا میں اسے پچھلی طرف سے آواز آئی

"غلام محمد---"

وہ اس کی طرف پلٹ کر بولا

"حکم کرو استاد جی"---

چلو یار دکان پر چلتے ہیں، صاحب جی تو لگتا ہے کسی گہری سوچ میں ہیں--- لگتا ہے رات کو گاڑی میں ہی سوئیں گے--- دکان اکیلی پڑی ہے کوئی ہاتھ کی صفائی ہی نہ دکھا جائے"---

وہ جانے لگے تو میں غلام مصطفیٰ کو آواز دے کر روک لیا۔ پھر غلام محمد اور غلام مصطفیٰ جلدی سے گاڑی کی مرمت میں مصروف ہو گئے

ظاہر ہے میں رات گاڑی میں سونے کا متحمل کب ہو سکتا تھا؟

☆☆☆☆☆

نیو مارکو پولو اور ابنِ بطوطہ [کہانی]

جس دن ''گلیلیو'' کی جان بخشی گئی، اُسی دن اٹلی میں ''کولمبس'' پیدا ہوا۔ شروع ہی سے وہ کشتیاں لے لے کر سمندر میں پھرا کرتا تھا۔ پھرتے پھراتے اُس نے ''ایک کتاب'' خاص اپنے پاس رکھ لی۔ اُسے پڑھتے پڑھتے، اُس کے کناروں پہ حاشیے میں سوچ سوچ کے ''نوٹس'' بھی لکھتا رہا۔

''تم'' میری کتاب گود میں لیے بیٹھی، حاشیے لگاتی، کس ''نئی دنیا'' کی تلاش میں ہو۔

دیکھ۔

میری ''تم'' تم اور کون؟

تمہی کو ڈھونڈنے میں نکلنے والا ہوں۔

میری بھی ساری راہیں تمہارے گرد گھومتی ہیں۔ تم کہیں بھی ہوئی تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔

یہ دنیا گول ہے۔

جس طرف سے بھی آؤں۔

پہنچوں گا تمہی تک۔

سمجھی؟

میری کتاب میں کہیں یہ لکھ لو، کنارے پہ۔

''کتاب'' وہ ''وینس'' کے ''مارکو پولو'' کی تھی۔ اپنے ابا ''نکولو'' اور چچا ''مافیو'' کے ساتھ وہ کم عمری سے ان کی کشتیوں میں یورپ سے نکل کے مشرق کی طرف آیا۔ راہ میں مصر گیا۔ ''سکندریہ'' ٹھہرا۔

اُدھر سے اوپر صحرائے سینا سے ہوتا ہوا ایران کی عظیم سلطنت کے بڑے شہروں میں گیا۔ ''تبریز'' کے اوپر ''بخارا'' جا پہنچا۔ پھر ''سمرقند''۔ اُدھر سے پھر پہاڑی راستوں اور دریائے سندھ کے کنارے کنارے ہوتا، ہمارے ''چترال'' بھی آیا۔ ''ہندوکش'' کے پہاڑوں سے گزرا۔ کشمیر کے اوپر اوپر سے مشرق کی طرف چلتا چلتا چین کے علاقے ''تبت'' چلا گیا۔ ''بدھوں'' کے ساتھ مہینوں رہا۔ ''جھکشو بنا'' اُن کے ساتھ پھرتا رہا۔ اُس نے راہ کے علاقوں کی زبانیں بھی سیکھیں۔

''تبت'' سے پھر اوپر ''زرد دریا'' کے نیچے ''چانگ جیانگ دریا'' کنارے چلتا چلتا چین کے شہر ''شانگو'' جا پہنچا۔

کہتے ہیں، چین میں وہ ''قبلائی خان'' کے دربار تک رسائی حاصل کر گیا۔ دربار سے عزت اور احترام ملا۔ انہوں نے اپنے علاقوں کے کئی عہدے بھی اُسے پیش کیے۔

''مارکو پولو'' کی طرح ''ابن بطوطہ'' نے بھی

ابدال بیلا

بہت سفر کیے۔ بلکہ ''مارکو پولو'' سے تین گنا زیادہ وہ پھرا۔

سب سے مزے کی بات ''ابن بطوطہ'' کی جانتی؟

وہ جہاں بھی جاتا، کوئی حسینہ ڈھونڈ کے اُس کے پیار میں دیوانہ ہوتا نہ ہوتا۔ اُس سے نکاح کر لیتا۔ کچھ دن قیام میں وصل کا مزہ لیتا۔ اگلے سفر پہ نکلنے سے پہلے مسکرا کے اپنی محبوبہ، بیوی کو طلاق دے دیتا۔ طلاق یافتہ بیوی جاتے ہوئے مسافر کو دور تک تکتی ہوئی مسکرا کے ہاتھ ہلاتی رہتی۔ اپنے برسوں کے سفر میں اُس نے کوئی سترہ شادیاں کیں۔

سوچو، اگر میں ''ابن بطوطہ'' ہوتا تو صرف تمہی کو لیے سارے سفر کرتا۔ مگر یہ کہانی ''مارکو پولو'' کی ہے، جو وینس سے نکلا تھا۔

''مارکو پولو'' ''وینس'' کی بیمار نہروں میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑتا آیا تھا۔ کسمپرسی والے چھوٹے چھوٹے مکان تھے اُن کے۔

یورپی لوگ اُن دنوں ''کروسیڈز'' کے بہانے عربوں اور ترکوں کے شہروں میں اُن کے سجے سجے گھر دیکھ کے حیران ہو گئے تھے۔ یورپ میں اُن دنوں ہوا کے لیے کھڑکیاں تو وہ گھروں بناتے تھے، مگر اُن کے اندر پردے لگانے کا اُدھر رواج نہ تھا۔ نہ اُن کے پاس اُس کے وسائل تھے۔ ترکوں، مصریوں اور دوسرے مسلمانوں کی شان و شوکت دیکھ کے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ عیاشی کے نت نئے طریقے جانے۔

چمچے، کانٹے کا استعمال بھی یورپ والے مسلمانوں سے سیکھ کے گئے۔ میز کرسی اور قالین کا استعمال بھی یورپ والوں نے اِدھر سے لیا۔ مگر ابھی یورپ والے یہ سوچ سوچ کے حیران تھے کہ ''ہندوستان'' اور ''چین'' کے خوشحال اور ترقی یافتہ علاقے کس قدر طلسماتی حسن سے بھرے ہوں گے۔

''ریشم'' سے مالا مال ''چین'' اور قیمتی مصالحوں، سونے چاندی اور موتیوں سے بھرا ''ہندوستان''۔

وہ اصل میں تیری تلاش میں تھے۔

ریشم کے لمس کو وہ بھول جاتے، اگر انہوں نے تمہارے جسم کو چھوا ہوتا۔

تمہارے ہونٹ۔

اوپر

نیچے

ریشم ہی ریشم

پھر تمہاری سانسوں میں ادھ کھلی گلاب کلیوں کی انہونی مہک۔

تم سانس میں سانس لیتی ہو تو جیسے گل قند روح میں انڈیل دیتی ہو۔

تلاش تو تیری ہی تھی۔

تیری ہی ہے۔

کہنے کو یہ متلاشی کبھی ''مارکو پولو'' کہلاتا، کبھی ''ابنِ بطوطہ''۔

''ابنِ بطوطہ''، ''مارکو پولو'' سے پچاس سال بعد پیدا ہوا تھا۔ مسلمان تھا۔ مراکش کا رہنے والا۔ طبیعت اُس کی نرالی، نت نئی جگہ کی اُسے تلاش رہتی۔ 17 سال کی عمر سے گھر سے نکلا۔

گھر والوں کو کہا، حج پہ جا رہا ہوں۔

واپس تیس سال بعد آیا۔

حج ایک نہیں چار بار کیا۔ پہلے تو سیدھا مصر گیا۔ اُدھر قائرہ سکندریہ، ''نیل'' کے ساتھ

ساتھ ایتھوپیا تک چلا گیا۔
پھر یاد آیا، حج بھی کرنا ہے "ریڈسی" پار کر کے حج کر لیا۔
اُدھر سے اوپر شام اور عراق میں "بغداد" جا بیٹھا۔ وہاں ایک بابا ملا، بولا تم نے میرے دو بھائیوں فرید الدین شکر گنجؒ اور جلال الدینؒ کو "پاک پتن" اور "مال دیپ" جا کے ملنا۔
اُدھر سے اٹھا تو پھر گھومتا گھماتا دوسرا حج کرنے پہنچ گیا۔
وہاں سے بھی کوئی سندیس ملا۔
اوپر سنٹرل ایشیا میں کسی کو ملنے کا حکم ملا۔ پھر مصر سے ہوتا ہوا فلسطین، شام، ایران سے اوپر ہمارے کشمیر آیا۔ ادھر سے ملتان پہنچا۔ "پاک پتن" حاضری دی۔
پھر اوپر پہاڑوں کو عبور کرتا "تبت" سے ہوتا "چین" پہنچ گیا۔
چین میں درباری مشیر بن گیا۔
کئی زبانیں جانتا تھا۔
جیسے "مارکو پولو" کئی زبانوں پہ عبور رکھتا تھا۔
"مارکو پولو" نے ہندوستان اور چین کے درباروں کے احوال دیکھے تو حیران رہ گیا۔ چین والوں نے اُسے بھی اپنا سفیر بنا کے ہندوستان بھیجا۔ وہ "دیت نام" کے اندر سے ہوتا ہوا نیچے "ملائیشیا" کے کنارے "سنگاپور" تک اپنی کشتی لے گیا۔ اُدھر سے "سری لنکا" سے "جزائر انڈومان" کے پاس سے ہوتا ہوا، اوپر ابھرا، پھر ہندوستان کی مغربی ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ اپنی کشتی چلاتا اوپر کے مڈل ایسٹ سے ہوتا ہوا، واپس اپنے ملک "وینس" پہنچا۔
چین کے "قبلائی خان" نے اُس کے ہاتھ "پوپ" کو دوستی کا خط لکھا تھا اور کہا تھا اپنے "سو بندے" بھیجو ساتھ "یروشلم" کے مقدس دیے کا تھوڑا سا تیل بھی۔
سترہ سال چین، ہندوستان، ایران، مصر سے ہوتا ہوا جب "مارکو پولو" اپنے ملک "وینس" پہنچا تو اُس کے پاس اتنے سارے ملکوں سے اکٹھے کیے ہوئے عجائبات اور بہت قیمتی پتھر، سونے چاندی کے زیور، برتن اور کئی انہونے تحفے تھے۔ اپنے ملک پہنچ کے وہ بہت خوش تھا، ابھی گھر چند میل دور تھا کہ "چوروں اور ڈاکوؤں" کے ایک گروہ، جو اُسی کے اپنے شہر سے تھے، انہوں نے "مارکو پولو" کو پکڑ لیا۔
اُس کی تلاشی لی۔
جو جو "سترہ سال" سے وہ مشرق کے دو براعظموں سے نایاب تحفے لایا تھا، وہ سارے انہوں نے لوٹ لیے۔
"ابنِ بطوطہ" کے ساتھ یہ سب نہ ہوا۔
وہ چین سے نکلنے لگا تو انہوں نے اپنی ایک "شہزادی" اُس کے ساتھ کر دی۔
وہ خوش۔
مگر چین والوں نے کہا، یہ شہزادی افغانستان کے فلاں شہزادے کو پہنچانی۔
سفر سمندر کا تھا۔
اُس وقت ہماری یہ "سی بیک" والی سڑک تھوڑی بنی تھی جو گھنٹوں میں چین کو ادھر ملا دیتی۔ وہ کشتی پہ جاپان کے نیچے سے ہوتا ہوا، "فلپائن"، "سنگاپور" کی راہ سے نیچے

نیچے گیا۔
''سری لنکا'' کے بھی نیچے کشتی لے گئی۔
ادھر ''جزائر انڈے مان'' آ گئے۔ وہ نئے نئے بدھ ازم سے ایک مسلمان ولی ''جلال الدین'' کی کرامت دیکھ کے مسلمان ہوئے تھے۔ ''ابن بطوطہ'' مذہبی آدمی تھا۔ انہوں نے اُسے ادھر ''قاضی'' بنا دیا۔
قاضی صاحب نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ یہ تمہیں پھر بتاؤں گا۔ پہلے مارکو پولو کی بات سنو۔
مارکو پولو لٹا کہ گھر پہنچا تو پتہ چلا، ملک میں حکومت بدل گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد فوجی اُس کے گھر دستک دینے لگے۔ وہ تو نہتا تھا، خالی ہاتھ۔ مگر ''فوجیوں'' کو وہ پتہ نہیں کیوں مطلوب تھا۔ وہ پکڑ کے ''مارکو پولو'' کو جیل میں بند کر آئے۔ اُس کی باقی زندگی قید میں گزری، ادھر ہی وہ فوت ہو گیا۔
''ابن بطوطہ'' ابھی زندہ تھا۔ مالدیب میں قاضی بنا پھرتا تھا۔ اُدھر ایک دن اُس کی نظر اک جوان تیکھی سوہنی لڑکی پہ پڑی جو ایک لونگی باندھے، سینہ پورا ننگا کیے اطمینان سے ساحل پہ اچھل اچھل کے ناریل توڑ رہی تھی۔
قاضی ''ابن بطوطہ'' سیخ پا ہو گیا۔
لاحول ولا قوۃ۔
یہ کیا بات، خود ٹکٹکی لگائے ادھر ہی دیکھے جائے۔
لوگ اکٹھے ہو گئے۔
''ابن بطوطہ'' انہیں قرآنی حکم بتانے لگا کہ حکم ہے کہ اپنی ''شرم گاہیں'' چھپا کے رکھو۔ لوگوں میں سے ایک سیانا بولا، سرکار، کڑی نے لونگی تو باندھی ہے۔ ''ابن بطوطہ'' اگلی آیت پڑھنے لگا ''اے نبیؐ کی بیویوں'' سیانے آدمی نے ہاتھ جوڑے، بولا، قاضی جی، یہ بے چاری۔ نبیؐ کی بیوی تھوڑی۔ ''ابن بطوطہ'' بہت چلایا، بہت شور مچایا۔ مگر لوگوں نے اُس کی بات پہ غور ہی نہ کیا تو وہ ادھر سے اپنی کشتی پہ بیٹھ کے بلوچستان کے ساحل طرف نکل پڑا۔ مگر ''مارکو پولو'' آ کے مر گیا اور فوت ہونے سے پہلے ایک انوکھا کام کر دیا۔ اُسی جیل میں ایک ''رومانوی ناول'' لکھنے والا ''رائٹر'' بھی قید تھا۔ وقت گزاری کے لیے ''مارکو پولو'' اُسے اپنے دیکھے ہوئے شہر، کیے ہوئے سفر سنانے لگا۔
''رائٹر'' نے جیل میں چوری چھپے کاغذ اور قلم دوات منگوائی۔ ایک دیا جلایا اور ''مارکو پولو'' سے ساری روداد سن کے ایک کتاب بنا دی۔ کتاب چھپ گئی۔
یورپ میں ''چین'' سے چھاپہ خانہ پہنچ چکا تھا۔ کتاب ''سپر ہٹ'' ہو گئی۔
دنیا ساری میں چھاپے خانے سے ٹھپا ٹھپ کتابیں چھپ رہی تھیں۔ سوائے مسلمان ملکوں کے۔ امیر ترین دنیا کے ملک مسلمانوں کے تھے، شہنشاہتیں بھی بڑی۔ سلطنت عثمانیہ، ہماری مغل ایمپائر، ہر جگہ مسلمان قاضی کا فتویٰ تھا ''چھاپہ خانہ'' شیطانی فعل۔
بچو۔
اُس زمانے میں آج کی طرح ''ایگزیکٹ'' ''نو دی سکیل'' دنیا کے نقشے نہیں ہوا کرتے تھے۔ بس جہاں جہاں کوئی باہمت شخص چلا جاتا، واپسی پہ وہ، وہ جگہ اندازے سے کاغذ پہ بنا دیتا۔

''ابن بطوطہ'' نے بھی واپسی پہ کتاب لکھی تھی۔
جزائر مالدیپ سے پھر وہ ہندوستان کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ کشتی چلاتا ہمارے سندھ بلوچستان کے ساحل کے پاس سے گزرا۔ ایران کی بندرگاہ اترا۔ اُدھر سے افغانستان گیا۔ جس شہزادے کو شہزادی حوالے کرنی تھی، اُس کے حوالے کی۔
مہینوں کے سفر میں، سمندر خشکی کے عجیب و غریب راستوں میں اُس شہزادی کا ساتھ ''ابن بطوطہ'' کی کتارگ جان رہا، یہ تھوڑا اس نے اپنی کتاب میں لکھنا تھا۔
یہ تو یہی ''بندہ'' ہے، جو تم سے وابستہ ہر بات، بغیر تمہارے ساتھ کو ساتھ لیے لکھے جاتا ہے۔ ہے نا، دنیا گول؟
''دنیا گول'' والا عقیدہ پھیل چکا تھا۔ ''گول دنیا'' کا گلوب بھی بنایا جا چکا تھا۔ مگر اُس میں یورپ اور نیچے افریقہ کے سامنے بڑے سمندر ''اٹلانٹک اُوشن'' کے پار وہ لوگ جاپان، چین اور ہندوستان بناتے تھے۔ ان ملکوں کے نقشے بھی اصل صورت سے بگڑے ہوئے تھے۔
''افریقہ'' کے گرد مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ، نیچے ''کیپ ٹاؤن'' تک یورپی ہو آئے تھے۔ جہاں اُن کا بحری جہاز تیز بھاگا، سفر جلدی کٹا، اُدھر انہوں نے ملک چھوٹا کر دیا۔
جدھر جدھر انہیں مشکل پیش آئی سفر آہستہ رہا، انہوں نے وہ علاقہ ''لمبا'' کاغذ پہ بنالیا۔
دیکھ جب تک تم کو نہ دیکھا تھا، تیرا ''نقشہ'' بھی میرے من میں عجیب سا تھا۔
کبھی تیری باتوں کو خوشبو میں نہایا ہوتا تو تیرے ''ہونٹ'' ذہن میں ایسے بناتا جیسے بیٹھے مالٹے کی تاشیں، جن سے جوس نکلنے پہ آئے تو لکتا جائے۔
تیرے سانسوں کے طوفان کو سوچتا تو تیرا سینہ ایسا چوڑا لگتا جیسے آسمان پہ پانی سے لدے نچڑنے والے کڑکتے بادل، جو برسنے پہ آتے تو موسلا دھار برستے۔
دیکھے، اَن دیکھے سے فرق تو پڑتا ہے۔
اب تو زمانہ تصویری گفتگو کا ہے، اب کیا بھید باقی۔
یہ تو اب اوپر ''سیاروں سے لی گئی ''ایگزیکٹ تصویروں'' کا کمال ہے کہ دنیا کا کوئی ملک کیا، ملک کا کوئی شہر، شہر کی کوئی گلی، گلی میں چلتا بندہ، ساتھ کھڑا سائیکل، موٹر سائیکل، کار، سب اوپر سے ''رئیل ٹائم'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔
اپنے گھر میں لگے، اندر باہر کے کیمروں سے ''بندہ'' اپنے ملک سے ہزاروں میل دور سے بھی گھر کے باہر منڈیر پہ بیٹھی چڑیا سے لے کر گھر کے اندر ڈائننگ ٹیبل پہ رکھی چائے کی پیالیوں میں ڈالے گئے گرم سیال کی رنگت بھاپ سے یہ بھی بھانپ لیتا کہ، کپ میں چائے پی گئی یا کافی۔
تمہیں ''چائے'' اور ''کافی'' کی کہانیاں بھی سناؤں گا، تم چائے کا ایک کپ پلا دو تو۔
دیکھ پری
تیری کھوج گورے بھی کر رہے۔
وہ اسی طرف آنا چاہتا تھا، آتے ہوئے منہ دوسری طرف کر کے،
کولمبس کی بات کر رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆

تیسرا کلمہ

جیسے ہی رابعہ بیگم کے نوکدار جوتے والے بھاری پیر کی ٹھوکر صائمہ کے پہلو میں پڑی تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔ رابعہ بیگم کی مسلسل ڈانٹ پھٹکار کے باوجود وہ چند لمحوں تک آنکھیں پھاڑے وہیں پڑی تکتی رہی۔ ان کی کوئی بھی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر جب بیگم صاحب نے اُسے اس کے ننھے مُنے استخوانی بازو سے پکڑ کر گھسیٹا تو اسے اردگرد ماحول اور صورتحال کا ادراک ہوا۔

عام طور پر تو وہ چھوٹے موٹے گھونسے، تھپڑ اور دھکے وغیرہ کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ اُس کے چہرے کے تاثرات تک نہ بدلتے۔ اس کا چہرہ بالکل پُرسکون رہتا۔ ایسا پیغمبرانہ مزاج کہ بعض اوقات تو اُس کے معصوم چہرے کو دیکھ کر گمان ہونے لگتا تھا کہ کوئی فرشتہ بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھنے آیا ہے۔

آج شاید اُسے بہت گہری نیند آگئی تھی۔ تب ہی یہ اضطراری اور جبلی ردِعمل اُس سے سرزد ہوگیا ورنہ وہ ایسی چیخنے والی کہاں تھی اور وہ بھی بیگم صاحب کے سامنے۔ حواس بیدار ہوتے اور صورتحال کا انداز ہوتے ہی وہ اُٹھی اور اُسی پیغمبرانہ سکون کے ساتھ ٹی وی لاؤنج سے نکل گئی بلکہ وہ اپنے اس طرح چیخنے پر کچھ شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

صائمہ کو اس گھر میں رہتے ہوئے اتنے ہی سال ہوگئے تھے جتنی اس کی عمر تھی۔ بخت بھری نے بڑے چاؤ سے اس کا نام صائمہ رکھا تھا۔ کم از کم یہ ایک چیز تو ایسی ہے جس پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اُس نے سوچا تھا۔ وہ اس گھر کے سرونٹ کوارٹر میں پیدا ہوئی تھی اور اب چھ سال کی ہونے والی تھی۔ بخت بھری کو یہ نوکری اپنے شوہر کی ملازمت کے

فرحت پروین

ہر جانے میں ملی تھی۔ غلام یٰسین، ملک صلاح الدین اور رابعہ بیگم کے ہاں کئی سال سے ڈرائیور تھا۔ پھر اُس کی شادی ہوگئی تو وہ اپنی بیوی بخت بھری کو بھی اپنے ساتھ لے آیا اور یوں گھر والوں کو مفت کی ملازمہ مل گئی۔ بڑے گھروں میں سو کام ہوتے ہیں۔ جتنے بھی ملازم ہوں، کم ہیں۔

صائمہ کی چیخ سُن کر استری کرتی بخت بھری لپک کر آئی۔

''کیا ہُوا؟'' سدا کی گونگی بخت بھری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''گولی ماری ہے میں نے'' رابعہ بیگم بگڑ کر بولیں۔

''اری، یہ تو اچھا نہیں کر رہی۔ غلط اُٹھا رہی ہے تو اسے۔ بیکار قالین پر پڑی اینڈ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اُٹھانا چاہا تو بجائے اُٹھنے کے وہیں پڑی پڑی چلانے لگی۔ میں کہتی ہوں نہ بگاڑ اسے۔ کل کلاں اِسے بھی یہی کام، یہی نوکری ہی تو کرنی ہے۔ ہڈیوں میں کام رَچا ہوا نہیں ہوگا تو جوتے کھائے گی سدا۔ اس کی ہڈیوں میں کام رچا کام، شہزادی کے یہ مزاج کیسے چلیں گے۔''

''کیا پتہ اللہ اس کے نصیب کھول دے جی۔'' آج پتہ نہیں بخت بھری نے کیسے کہہ دیا۔

''ہاں نصیب کھلے بھی تو یہ کام کاج تو اسے کرنا ہی ہوگا۔ اب موری کی اینٹ چوبارے لگنے سے تو رہی'' رابعہ بیگم اور بھی بہت کچھ کہتی ہوئیں کچن کا معائنہ کرنے چل دیں۔

بخت بھری نے بیٹی کو کوارٹر کی طرف جاتے دیکھا اور پھر سے کپڑے استری کرنے لگی۔ حالانکہ اُس کا کتنا دل چاہ رہا تھا کہ جا کر اُسے دیکھ تو آئے۔ وہ ایسی چلانے والی کہاں تھی۔ کچھ زیادہ ہی چوٹ لگی ہوگی۔ ادھر کوارٹر میں تھا ہی کون، اکیلی بیٹھی روئے گی۔

غلام یٰسین کا تین سال پہلے گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا۔ صاحب کو دفتر پہنچا کر واپس آرہا تھا کہ اچانک سامنے والے سائیکل سوار کو بچاتے بچاتے گاڑی بے قابو ہوگئی۔ موقع پر ہی چل بسا۔

یتیم صائمہ اور بیوہ بخت بھری کو رابعہ بیگم نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ صرف کھانے اور اُترن پر ملازمہ ملتی ہے کیا؟ اور بھی چھوٹے موٹے کام کر لیتی تھی۔

پہلے تو وہ زیادہ تر برآمدے میں بیٹھی رہتی تھی۔ اب بیگم صاحبہ اُسے بلا کر کسی اور کسی کام پر لگا دیتی تھیں۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کی پتلی پتلی اُنگلیوں سے بڑی نفاست اور شوق سے سجاوٹ کے سامان کی جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ کام ختم کر کے نرم نرم قالین پر دم بھر کو لیٹی تو شاید اس کی آنکھ لگ گئی۔ بچی ہی تو تھی۔

رابعہ بیگم بڑی دیندار و پرہیزگار خاتون تھیں۔ پابند صوم وصلوٰۃ اور تہجد گزار، درود وظائف کا شغل بھی کثرت سے رہتا۔ کتنی

ہی حدیثیں اُنھیں ازبر تھیں۔ مسئلے مسائل سے بھی خوب واقف تھیں۔ ''در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری۔'' سو رابعہ بیگم بچپن ہی سے شیوہ پیغمبری پر..... نیکی کا غرور تو ہونا ہی تھا۔ گھر کی فضا میں کچھ اس طرح کا پُرجلال تقدس چھایا رہتا کہ ان کے ہاں آنے والا کوئی بھی شخص رُعب کھائے بغیر نہ رہتا تھا۔

رابعہ بیگم کے ہاں شادی کے آٹھ سال بعد عبداللہ پیدا ہوا تھا اور اس کے آٹھ ہی سال بعد فاطمہ اور اب تو فاطمہ بھی پانچ سال کی ہو چلی تھی۔

ملک صلاح الدین کو کاروبار وارثت میں ملا تھا، اُسی کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ خاصے خوشحال تھے۔

رابعہ بیگم فون پر اپنی سہیلی سے محوِ گفتگو تھیں:

''میں نے سات سال کی عمر میں ناظرہ قرآن پاک پڑھ لیا تھا۔ کتنی ہی سورتیں بھی حفظ تھیں۔ الحمدللہ مجھے نہیں یاد میری کوئی نماز بلاناغہ چھوٹی ہو'' اور پھر وہ اپنے معمولات بتانے لگیں..... ''ہاں ہاں..... ہاں میری خواہش ہے کہ فاطمہ بھی سات سال کی عمر تک کم از کم ناظرہ قرآن پاک ہی پڑھ لے۔''

فون پر بات کرتے کرتے وہ بیچ میں سے اپنی بیٹی کو پکارنے لگیں: ''فاطمہ! وضو کر لو بیٹا۔ چلو شاباش، تیسرا کلمہ یاد کرو، میں ابھی سنتی ہوں۔

فون بند کرنے کے بعد اُنھوں نے پکارا: ''صائمہ، اری او صائمہ، کہاں مر گئی؟''

''کوارٹر میں ہو گی بیگم صاحب!'' بخت بھری نے لپک کر باورچی خانے کے دروازے میں سے نمودار ہو کر جواب دیا۔

''یہ کوارٹر میں کیا کرنے چلی جاتی ہے گھڑی گھڑی۔ جان بچاتی ہے کہ کوئی کام ہی نہ بتا دے۔ حرام خور!''

ننھی سی جان صائمہ کا دھان پان سراپا بخت بھری کی نظروں میں اُبھرا۔ اُس کے دل میں کسی نے جیسے چٹکی سی بھری۔

''اب اسے بُلانے کے لیے نوکر رکھنا پڑے گا کیا؟'' بیگم صاحب نے طنز کے نشتر چلائے۔ کیونکہ انھیں بخت بھری کا جواب دینا اب تک کھٹک رہا تھا۔

بخت بھری تیزی سے کوارٹر کی طرف بڑھی۔

''اس کا دماغ درست کرنا پڑے گا'' انھوں نے سوچا۔ ماں بیٹی لومیں۔

بخت بھری تو باورچی خانے میں چلی گئی اور صائمہ بیگم صاحبہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ انھوں نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے اُسے جھٹکے سے نیچے بٹھایا اور اپنے بھاری بھرکم پاؤں اُس کی گود میں رکھ دیے۔ وہ اپنے ننھے ننھے نرم ہاتھوں سے اُن کے پاؤں دبانے لگی اور وہ خود پورے انہماک سے فاطمہ کو تیسرا کلمہ رٹوانے لگیں۔

☆☆☆☆☆

فیروزی رنگ کا جوڑا

فرخندہ شمیم

آدم اور حوا کی ملاقات کہیں بھی ہو، اہم یہ نہیں، اہم چیز مقصد ہے..... عقبی کہانی کیا ہے، پیغمبر آدم اور ان کی جوڑی حوا، سری لنکا کے بجائے کراچی کے ساحل پر بھی ملتے تو منشور میں بہرحال آبادکاری لکھی تھی، مقصد محبت ہی تھا۔ یہ الگ تخمینہ ہے کہ محبت کے نتیجے میں دنیا کا ہر چپہ کتنی کتنی آبادی سے اٹا؟

سروش بھی علینہ کو ایک جگہ دیکھ کر مانو ٹھٹھک گیا تھا۔ ایک شاپنگ مال کی اوپری منزل سے برقی سیڑھیوں پر بہتی وہ نیچے فلور کی جانب آ رہی تھی ہاتھ شاپنگ بیگز میں لدے اور کندھے پر سیاہ بیگ پھسلا جا رہا تھا۔ وہ بہت خوش شکل تھی سروش کا جی چاہا وہ آگے بڑھ کر اس کا سامان تھام لے یا خود اسے سنبھال لے لیکن یہ کوئی لق ودق صحرا نہیں تھا جہاں آدم نے حوا کو جا تھاما تھا اور وہ ناراض بھی نہیں ہوئی تھیں۔ یہاں تو پولیس بھی آسکتی تھی۔

البتہ محبت کی دہلیز پر کوئی جھگڑی دیر تک کہاں لہرائی جاسکتی ہے۔ سروش آخرش اس تک پہنچ گیا، اور متاثر بھی کر گیا۔ دوشیزہ ایک خوشگوار مزاج کی یونیورسٹی طالبہ تھی مال

کے اس خوبصورت کیفے میں چائے پر باتیں کرتے کرتے خوب اچھا تعارف ہو گیا تھا دونوں میں۔

سروش ایک متمول مگر مہذب نوجوان تھا، حسن پسند تو تھا مگر ذوق لطیف کو وقار پر دیکھنا چاہتا تھا، کسی سلیقے سے مرصع حسن انتخاب کا متلاشی تھا نسوانیت جس میں بلند مرتبے پر متمکن ملتی ہو۔

علینہ کو دیکھ کر اسے کچھ ایسا ہی لگا تھا۔

ملبوس میں ایک انوکھے سلیقے سے بنت کار تھی اس میں.....لباس کے ساتھ ساتھ بال جیولری جوتے، ہینڈ بیگ میک اپ سب ایک دوسرے کے ساتھ ایسے سجاوٹ میں گویا آپس میں خون کے رشتے دار ہوں۔

ایک مرد ہونے کے باوصف وہ اس ترتیب کے پیچھے کارفرما نسوانی ہنر کاری کا اسلوب جاننے پر مصر تھا اور الجھتا تھا کہ ساری عورتوں میں یہ تہذیب کیوں نہیں ہوتی اور یہ کہ قدرت کی اس حسین تخلیق میں سبکو یہ سب کیونکر سکھایا جائے؟

علینہ سے اب اس کی ملاقاتیں اکثر ہونے لگی تھیں۔

وہ بھی سروش کے حسنِ ذوق کی قدر کرتی اور ہر ملاقات پر فائن آرٹس کی کسی طالبہ کی طرح پینٹ کلر کا کوئی نیا برانڈ بن کر آجاتی۔

سروش اسے ایسے غیر معمولی انداز میں دیکھتا کہ وہ کبھی تو شرما جاتی اور کبھی جدید ٹیکنالوجی کے ہزاریے میں پلی کسی تیکھی لڑکی کی طرح سوچتی

یہ شخص میرے اندر سے پوائنٹس چرا کر اپنی کسی ذاتی کامیابی کا پیپر تو نہیں لکھ رہا ہے؟

لیکن ٹیکنالوجی کیسی ہی پراڈان ہو، رومان کے سامنے زیر ہو جاتی ہے.....علینہ کو سروش سے محبت ہو رہی تھی۔

میکڈونلڈ سے واپسی پر جب وہ گاڑی میں بیٹھے تو سروش نظر بھر بھر کر علینہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس قدر سادہ لباس میں اس کا میک اپ کتنا عمدہ تھا جو اسے مچھلی سے جل پری بنا رہا تھا۔

اس نے سفید رنگ کے لباس کو مختلف لوازمات سے چاند بنانے کے طریقے ایک ہی نشست میں علینہ سے پوچھ ڈالے۔

علینہ، تم اتنا کوالٹی میک اپ کیسے چوائس کر لیتی ہو۔ بے شمار لوگوں میں تو اس کی سینس ہی نہیں ہوتی؟

علینہ بے اختیار ہنس پڑی۔

سروش مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے تم کوئی بیوٹی پارلر کھولنے والے ہو یا کاسمیٹکس کی کسی شاپ میں دلچسپی لینے لگے ہو یا پھر...

وہ بڑی معنی خیزی کے ساتھ رک گئی

یا پھر؟

سروش نے پوچھا
یا پھر اپنی کسی محبوبہ کو سنوارنے کے لیے اتنی محنت کر رہے ہو؟
اب کے سروش کے چہرے پر ایک تبسم سا رینگ گیا تھا ...
''چلو یونہی سمجھ لو''
بے اختیار اس کے لبوں سے نکل گیا۔
کون ہے وہ؟ علینہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔
''ابھی نہیں بتا سکتا'' - وہ شرارت میں چور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
علینہ بہت زیادہ شرمانا چاہتی تھی، لیکن اتنا کٹھن کام اس نے کبھی کیا نہیں تھا، بس ایک قہقہہ مار کر خود کو بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گئی اور وہ شام بھی بیت گئی۔
اگلے ہفتے علینہ فیروزی رنگ کے سوٹ میں ملبوس اسے ملی تو وہ جیسے پاگل ہی ہو گیا۔
سروش کی بہت بڑی کمزوری تھا یہ رنگ۔ علینہ نے بھی تو کمال کیا تھا آج سوٹ کے رنگ سے۔ ہم رنگ فیروزی جیولری، بے حد نفیس میک اپ چمکتے فیروزی رنگ کے جوڑے پر غیر معروف رنگوں میں انتہائی سرایت شدہ کڑھائی، کمال مہارت سے..... گویا عشق پیچاں سے لپٹی ہوئی کوئی دوشیزہ، رانجھے سے پیوست کوئی ہیر، کسی پنوں کے پہلو میں بیٹھی کوئی سسی.....
وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے غرق ہی ہو جائے گا یا پھر جیسے کوئی ضروری سبق یاد کر رہا ہو بلکہ جلدی جلدی رٹ رہا ہو، پرچہ دینے کا وقت گویا قریب ہو..... پھر یکا یک وہ پُرسکون ہو گیا، یوں جیسے امتحانی پرچے کے سارے سوالوں کے جواب اسے آتے ہوں۔
علینہ الجھی الجھی سی گاڑی کی نشست پر بیٹھی اس مدوجزر کو دیکھتی رہی۔ اور... بالآخر شام وہ بھی گزر گئی۔
علینہ بہت بددل ہوئی، لیکن دو روز بعد ہی سروش نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ اسے بتایا کہ اس کے والدین وطن واپس آ گئے ہیں اور وہ علینہ کی مہمان داری کرنا چاہتے ہیں۔
علینہ کی آنکھوں میں ستارے جھلملا گئے۔ ایک خوش کن تصور اسے چاند تک لے گیا۔
وہ سروش کے گھر والوں سے مل کر بہت سرشار ہوئی... آج اس نے وہی فیروزی جوڑا پہنا تھا جو ایک شام سروش کو دیوانہ بنا رہا تھا..... لیکن اس منظر میں ایک اور فیروزی ہیولہ بھی اچانک کہیں سے آن پہنچا تھا۔
بے حد دلربا ایک نوجوان لڑکی پاس کے کمرے سے نکل کر یکا یک سروش کے قریب آ بیٹھی اور معصومیت سے پلکیں

جھجک جھجک کر سب کو دیکھنے لگی...... سروش کے والدین اس حسینہ کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوئے جاتے تھے۔

خود سروش گردو نواح سے بے نیاز محبت پاش نظروں سے کلیوں جیسی اس سبک لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا علینہ کو تعجب ہوا۔ اس طرح تو وہ صرف علینہ کو دیکھا کرتا تھا۔

خواب گزیدہ عورت ہمیشہ بغیر ثبوت کی محبت میں ماری جاتی ہے......اور پھر اپنے بال نوچتی پھرتی ہے......

"یہ نویدہ ہے، میری بیوی" سروش کی آواز ابھری۔

علینہ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا، اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پورے کا پورا منظر صرف نویدہ پر واری تھا۔ اس کے دل میں ٹوٹی کرچیاں کوئی آواز نہ اچھال سکی تھیں۔

ماشاءاللہ

میری بہو، بے حد خوبصورت ہے اور بہت زیادہ سادہ مزاج بھی۔

سروش کی والدہ کمال محبت سے بول رہی تھیں۔

نویدہ کو پہاڑوں سے سروش نے ڈھونڈا ہے یہ میرے سروش کا جنون ہے ۔ والدہ نے بتایا۔

یہ جب اسے بیاہ کر لایا تو اس سادہ تصویر میں کوئی رنگ نہیں تھا۔ سروش اسے سارے ذوق سکھانا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی اچھی لگے مگر اس مقصد کے لیے وہ اسے کہیں تربیت کے لیے بھیجنے پر تیار نہیں تھا...... انھوں نے توقف کیا۔ خوش قسمتی سے اسے آپ کی صورت میں ایک خوش گوار اتالیق مل گئی تو اس نے اپنی بیوی کو سجانے کے طریقے آپ سے سیکھ لیے اور روزانہ اسے اپنے ہاتھوں سے نکھارنے لگا۔

آج خاص طور پر اس نے نویدہ کو اپنا پسندیدہ فیروزی رنگ پہننے کو کہا اور زبردست میچنگ کی جس کی ٹریننگ آپ اسے دیتی رہیں......اور اتفاقاً آج آپ نے بھی وہی رنگ پہنا ہے۔

یکایک سب کی نظریں پہلی بار علینہ کی طرف اٹھیں - خود سروش کی بھی۔ لیکن آج سروش صرف نویدہ کا اسیر تھا. نویدہ اس کی نظروں سے پاش پاش ہو رہی تھی...... وہ آگے بڑھی اور علینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے سلیقے سے اس کا شکریہ بجا لائی

آپ نے مجھ پر بہت محنت کی ہے، میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

اس نے ایک خاص رسان سے کہا تھا۔ علینہ زبردستی مسکرا دی......اس نے نظر جھکا کر اپنے لباس کو دیکھا

اپنے فیروزی پیرہن میں اب اسے سانپ کی پھنکار سنائی دینے لگی تھی ...

☆☆☆☆☆

خواب

خواب کے بارے میں لکھنے لگیں تو سینکڑوں صفحے کالے ہو سکتے ہیں خواب کے سچے اور جھوٹے ہونے کے بارے ہزاروں دلیلیں دی جا سکتی ہیں ہزاروں نفسیاتی تجزیے، تبصرے اور نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ شاعری میں خواب کی بہت اہمیت ہے۔ خواب ایک استعارہ ہے۔ میں بھی ایک خواب کو لکھنا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ کی نظر میں اس کی اہمیت نہ ہو، مگر خواب تو خواب ہے۔ ایسے خواب اگر سچ ہو جائیں تو یہ دنیا یکسر بدل جائے۔ پہاڑوں، آبشاروں، ندی نالوں کی روانی، جنگل، بیابان، صحرا، سمندر سب ہی تو خوابوں میں چکراتے رہتے ہیں۔ بچپن ہی سے نیاگرا فال کے بارے میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی اور شاندار آبشار ہے۔ فلموں، ڈراموں میں یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر تو اور شوق ہوا کہ ان کو دیکھا جائے پھر آج کل ایک فلم "باہوبلی" دیکھ لی۔ پھر کیا تھا سارا دن جل پربت دماغ میں گھومتا اور رات اس کے خوابوں میں گزر جاتی ہائے کاش! پاکستان میں بھی ایسی ہی ایک شاندار جھیل ہو۔ دنیا بھر سے لوگ اُسے دیکھنے آئیں۔ ہائے کتنا اچھا ہو۔ دماغ بس انہی خیالات سے بھرا رہتا ہے۔ بچوں کے ساتھ کالام جانے کا پروگرام بنا دنیا کے حسین ترین علاقے دیکھنے کو دل چاہتا ہے بس یہیں کہیں رہ جاؤں مگر زندگی کی ضرورتیں واپس لاہور کھینچ لاتی ہیں۔ کاش لاہور کے اردگرد پہاڑ ہوتے۔ بس ایک شملہ پہاڑی موجود ہے جو لاہور پریس کلب نے سنبھال رکھی ہے۔ لہٰذا پہاڑوں پر پہنچ کر سکون مل گیا۔ ہوٹل میں کمرہ لیا، سامان رکھا، فریش ہوئے اور چائے پی، بچے بہت پرجوش ہو رہے تھے باہر گھومنا چاہتے تھے۔ میں چونکہ پہاڑوں

آسناتھ کنول

میں لمبا سفر کر کے زیادہ ہی تھک گئی تھی۔ ذرا آرام کرنا چاہتی تھی۔ بچے تو باہر نکل گئے اور میں نے بیڈ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ہاں وہ کوئی خواب ہی تھا۔ ایسے تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ اتنی حسین وادی اور اس میں گرتی حسین آبشاریں، نیاگرا فال سے بھی زیادہ خوبصورت، اتنے حسن کی دہشت نے مجھے گنگ کر دیا تھا۔ میں بیچ بیچ پاؤں رکھتی پہاڑوں کی بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ میرے ساتھ پہاڑی ہواؤں کے جھکڑ بھی تھے۔ پتہ نہیں کون سی طاقت مجھے لئے جا رہی تھی۔ پاؤں میں بہت سے چھالے بن گئے حتیٰ کہ خون بہنے لگا۔ بند فلیٹ تھے جن کے تلوے گھس گئے تھے۔ کبھی کبھی گھاس کا کوئی قطعہ بھی نظر آ جاتا تو جیسے سکون میسر آ جاتا۔ کبھی کبھی تو سورج کی تیز کرنیں کسی نیزے کی انی جیسی وجود میں اُتر جاتیں۔ تھوڑا سا آگے جاتی تو دیوداروں کا جنگل سائبان تان دیتا۔ عجیب سی مہک تھی۔ پرندوں کی آوازوں نے سارے سکوت کو عجیب سی نغمگی سے بھر رکھا تھا۔ ایک طرف دریا اپنی موج میں جھاگ اُڑاتا، شور مچاتا پتھروں سے سر ٹپکتا اپنی جلوہ نمائیوں میں مصروف تھا اس کا جاہ و جلال تو کبھی کبھی میرے دل کو ہلا دیتا تھا۔ دھوپ چھاؤں کے ان حسین مناظر میں مجھے بس اوپر جانا تھا، چوٹی پر پہنچنا تھا۔ وہاں کچھ تھا جو مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا، کھینچ رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی غیر مرئی بدن مجھے راستہ دکھا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے پانی کی دھند چھانے لگی مگر مجھے تو چلنا ہی تھا، پتھروں پر لہو کے دھبے اپنا نشان چھوڑتے جاتے تھے۔ اس پہاڑی سلسلے کے جنگلوں میں آہ و نالہ بے کار تھا درخت یوں اِدھر اُدھر بکھرے تھے جیسے کسی نے بچوں کو مٹھی میں بھر کر لاپرواہی سے پھینک دیا ہے۔ اچانک اک ہوک سی سنائی دی۔ میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا آواز کی سمت معلوم کرنی چاہی مگر ہوا کا ایک جھونکا اس ہوک کو کہیں اور لے گیا۔ میں جتنا فاصلہ طے کرتی، لگتا ابھی راستہ سے اس سے دُگنا پڑا ہے۔ مجھے بہر صورت اس پہاڑ کی چوٹی پہ جانا ہے جہاں میرا کوئی راستہ دیکھتا ہے۔ مگر کون؟ میں نے دھیان لگانے کی کوشش کی۔ ایک چیڑ کے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کافی دیر لمبی لمبی سانسیں کھینچتی رہی۔ کیا میں کسی کو جانتی ہوں؟ ایسا کون ہے جو یہاں ہے۔ مجھے کس کی بشارت ہوئی تھی۔ کیا اس نے پہاڑ پر ملنے کا وقت اور جگہ طے کی اور کب کی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ دل محض وسوسوں سے دھڑک رہا ہے۔ پاؤں ساتھ دینے سے انکاری ہیں۔ آنکھیں منتظر اور مضطرب ہیں اور میں نا تراشیدہ پگڈنڈیوں پر رفتہ رفتہ

فاصلہ طے کرتی جاتی ہوں۔ بھلا اوپر چوٹی پر کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، دل نے کہا اوپر چلو تو پتہ چلے گا۔ دماغ نے دلیل پیش کی۔ وجود نے تھکن کا نعرہ لگایا۔ پیروں نے چلنے سے انکار کر دیا اور ہاتھ مایوسی سے اپنا آپ جھٹک رہے تھے۔ کیا کروں؟ سارا بدن بغاوت پر آمادہ تھا مگر میرے ارادے نے کہا کہ اوپر جانا ہے۔ اوپر جاتے جاتے کہیں زیادہ اوپر نہ چلی جاؤں، دل نے ٹوکا۔ سورج بھی چلتے چلتے تھکنے لگا تھا۔ وہ اپنی آرام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ وقت نے اس کا رنگ پیلا کر دیا۔ سائے سے بڑھنے لگے۔ مگر میرا سفر اک سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ شام دھیرے دھیرے درختوں سے نیچے اُترنے لگی۔ پرندوں کی بولیاں کم ہو رہی تھیں۔ دریا پر شور نیچے ان کہساروں کی تہوں میں کہیں رہ گیا تھا۔ کسی پچھلی شام سے چل رہی تھی مگر بھوک پیاس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ تو اب معدہ دہائی دینے لگا۔ زبان تالو سے جا لگی۔ ہونٹ خشک ہو کر جدائی پر آمادہ تھے۔ جنگل بھی ختم ہونے کو تھا بندر اُچھل کود بھول کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ چیتا نکل آیا تو۔۔۔ خوف سے ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ ایسا کچھ ہو مجھے چوٹی پر جانا ہے۔ وہاں محفوظ ہو جاؤں گی۔ میں نے پھر ایک نئے حوصلے سے سفر کو مات دینا شروع کر دی۔ ایک ایک لکڑی کو سہارا بنایا۔ شام نے رات کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں ٹامک ٹوئیاں مارتی لکڑی کے سہارے راستہ ڈھونڈتی چلتی رہی۔ پتہ نہیں کتنا چلا ہوں گی۔ بس کوئی جوش جنون چوٹی کی طرف لیے جاتا تھا۔ اچانک ملگجی سی روشنی پھیلنے لگی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند اپنے ستاروں کی ہمراہی میں فلک پر جلوہ افروز ہو چکا تھا۔ اس کی سفید چاندنی نے لمحوں کو عجیب سی مستی اور حسن عطا کیا تھا۔ کہساروں کی خوفناکی کچھ کم ہوئی، چاند پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا جیسے دودھ سے نہا کر آیا ہو۔ ستاروں کی چمک بھی تابناک تھی۔ درختوں کے سائے اکا دُکا بڑے ہو رہے تھے۔ کتنا سمے بیت گیا، کچھ پتہ نہ چلا۔ بس اتنا کہ چوٹی کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اچانک ایک غراہٹ نے میرے قدم جکڑ لیے۔ اک بڑی چٹان نے مجھے پناہ دی۔ میں نے غراہٹ کی جانب دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کوئی بڑا سا چیتا یا لومڑ تھا اجنبی کی بو پا کر غرانے لگا تھا۔ اب کہاں جاؤں؟ وہیں تو جانا تھا جہاں وہ کھڑا تھا۔ اب کیا کروں وہیں دلیلیں باندھتی دیکھی رہی۔ قریب ہی ایک پھنکار نے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میرے سامنے ایک ناگ ناگن پھن پھیلائے مجھے گھور رہے تھے۔ شاید

پوچھ رہے تھے کہ کون ہو اور یہاں کیا کرنے آئی ہو؟ ہوسکتا ہے اس چٹان کے نیچے ان کا گھر ہو اور میں نادانستگی میں ان کے گھر پر آ بیٹھی۔ اب اُٹھوں کیسے؟ چاروں طرف سے خطروں سے گھر چکی تھی۔ پیچھے کھسک جاؤں تو کیسے؟ میں نے سوچا مگر پیچھے تو کھائی تھی ہزاروں فٹ جس کے نیچے دریا چنگھاڑتا ہوا اپنا غیض وغضب دکھا رہا تھا۔ یا اللہ کہاں جاؤں؟ اب مجھے اس مصیبت سے نکال۔ میں نے لکڑی کے سہارے اُٹھنے کی کوشش کی۔ خوف سے میرے بدن کے سب مساموں سے پانی بن کر بہہ رہا تھا۔ آنکھیں بند ہونے کو تھیں۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر ناگوں کو لکڑی سے ڈرانے کی کوشش کی۔ خود چٹان کے سہارے کھڑے ہوئی۔ مرنا ہی ہے تو مقابلہ کر کے مروں۔ اتنی صعوبتیں سہہ کر یہاں تک پہنچی ہوں تو اب موت کا خوف کیسا؟ میں نے خوف کو لاٹھی سے ٹھوکر ماری۔ اِک پتھر اُڑ کر دُور جا گرا۔ ناگ تیزی سے اِک اتراتی میں اُتر گئے۔ شائد اُنہیں مجھے کاٹنے کا حکم نہیں تھا۔ سیدھی کھڑی ہوئی تو اتنی دیر میں درندہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ بس تھوڑا سا ہی فاصلہ تھا۔ میں نے ہمت کو پاؤں سے باندھا اور چل پڑی اور پھر آخری لمحہ چوٹی پر پہنچی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بمشکل آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا اِک خوفناک سناٹا چاروں اور پھیلا ہوا تھا۔ چاند کی روشنی بھی اس دہشت کو کم نہیں کر سکی۔ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ دل کسی نامعلوم خطرے کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ آنکھیں پلکوں سے چپک گئیں اور سر پتھر سے جا لگا۔ میرے اندر باہر، آگے پیچھے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اِک سیاہی کی چادر نے میرے وجود کو ڈھانپ لیا۔ پھر وہاں کتنی صدیاں بیتیں، کتنے یگ گزر گئے یا شائد پلک ہی جھپکی، مجھے کچھ پتہ نہیں۔ ہوش آیا تو اِک پہاڑی کٹیا میں گھاس پھوس کے بستر پر پڑی تھی۔ پیروں اور گھٹنوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ بمشکل آنکھیں کھولیں۔ لیٹی رہو بیٹی۔ اُس کی آواز ہوا کے دوش پر میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ میں نے گردن موڑ کر روشنی کی سمت دیکھا۔ ایک نورانی صورت بزرگ کسی فرشتے جیسی معصومیت اور پاکیزگی لئے کھڑا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ پتہ نہیں یہ انسان بھی ہے کہ نہیں، کوئی درویش، کوئی رشی مُنی، کوئی ولی اللہ، کوئی سینٹ، کوئی سادھو سنت، پتہ نہیں کون تھا۔ تم نے اچھا کیا بیٹی یہ سفر کیا۔ تمہارے سوال کا جواب ہے میرے پاس۔ اُٹھو یہاں آؤ اور دیکھو۔ باہر بہتے ہوئے اُبلتے گرجتے پانیوں کا بے بہا شور تھا۔ اُٹھو اس نامعلوم فرشتے نے میرا

ہاتھ تھاما تو میں چھلانگ لگا کر اُٹھ کھڑی ہوئی یوں جیسے مجھے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے ہاتھوں کی ساری توانائی میرے بدن میں اُتر گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اُس کے چہرے کی الوہی مسکان نے میری ساری تھکن چوس لی۔ اس کے لمس نے مجھے زندگی سے ہمکنار کر دیا۔۔ اس کے لمبے سفید بال پشت تک آرہے تھے۔ اس کی سفید براق داڑھی سارے سینے پر پھیلی تھی اس کی آنکھوں کی روشنی میں دیکھ نہیں پائی۔ یہ آسمانی روپ میں یقیناً کوئی فرشتہ تھا جو مجھے بچانے آیا تھا۔ اس کے نورانی چہرے کی روشنی اُسے دیکھے بغیر میرے وجود کو گھیرے ہوئے تھی۔ اس کٹیا کا تقدس اور پاکیزگی یوں لگا جیسے میں ہواؤں میں تیر رہی ہوں۔ میرے بازوؤں کے ساتھ بادل بندھے ہوئے ہیں۔ میں کتنی دیر اس انوکھی الوہی کیفیت کا شکار رہی۔ سنو تمہارے دل کی جلتی ہوئی آگ آنچ بن کر مجھ تک پہنچی۔ مجھے بھیجا گیا کہ تمہاری جلتی بھڑکتی خواہش کو پورا کروں۔ تمہیں دکھادوں کہ دنیا میں کچھ بھی حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے محنت اور کوشش ضروری ہے جیسے تم نے کی۔ اگر تم اس پاکیزہ چوٹی تک نہ آتی تو اپنی خواہش کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی۔ یہ صرف اس لئے پوری ہوئی کہ تمہاری تمنا نیک تھی، نیت صاف تھی، دل درست سمت گامزن تھا۔ اس لئے تمہارے قدم رُکے نہیں۔ اگر رُک جاتے تو شاید اس چوٹی تک کبھی نہ پہنچتی۔ یہ چوٹی ایسی ہے جس پر کبھی کوئی نہیں چڑھا۔ دراصل اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اِک خوف کی لہر سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی گہرے پانیوں جیسی آواز میرے دل کو دہلا رہی تھی۔ اِک گھن گرج، اِک جاہ وجلال۔ اتنا بے شمار رطب، نجانے کیسے میں سہتی چلی گئی۔ سوچتی رہی ان حیرتوں کے درمیان میں اب تک زندہ ہوں؟ وہ گمبھیر گہری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ باہر آؤ اور دیکھو تمہارا خواب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میرا خواب! میں تو اتنے عرصے میں اس خواب کو بھی بھول چکی تھی۔ میں اس نورانی صورت کے پیچھے پیچھے باہر آئی تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دل کو کسی طور یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ میں نیاگرا آبشار کے درمیان میں کھڑی تھی۔ پانی اپنا جوش دکھاتا پتھروں سے سر پٹختا اپنا غیض وغضب دکھاتا نیچے کہیں کسی دریا میں گر رہا تھا۔ یہ کتنی بلندی تھی یہ تو کوئی بھی نہیں جان سکتا، مجھے ایک چکر سا آگیا۔ اتنا پرفریب اور اتنا ہیبت ناک نظارہ دیکھنے کی مجھ میں تاب کہاں تھی۔ بڑا حوصلہ چاہیے تھا، مجھ میں حوصلہ کہاں! بڑی بڑی بلند چٹانوں اور بے شمار پانیوں کی چوٹی پر بادل مجھے چھو کر مجھے اک تحیر میں ڈبو رہے تھے۔ یہ

تو بس آخری نظارہ ہے - پیچھے مڑی کہ بزرگ کو دیکھوں مگر یہ کیا وہاں تو اک پانی کا سمندر تھا جو بہتا اور گرتا چلا جا رہا تھا پھر جو چکر کھایا تو خوف و دہشت نے میرے پاؤں اُکھاڑ دیئے- میں پانی کے ساتھ بہتی چلی گئی- پھر ہوش وحواس کی دنیا سے بیگانہ ہو گئی- دفعتہً سوئی چبھی تھی- درد کے احساس نے آسمان سے زمین پر لا پٹکا تھا- ایک طرف کچھ کھسر پھسر تھی- ایک طرف کسی کے رونے کی آواز تھی- میں کہاں ہوں- سر تا پا بھیگی ہوئی تھی غالباً بخار کی تیزی نے بے حال کر کے پسینہ پسینہ کر رکھا تھا- انگ انگ درد سے ٹوٹ رہا تھا ڈاکٹر صاحب مریضہ کو ہوش آ گیا ہے - نرس نے دوڑ کر ڈاکٹر صاحب کو بتایا- ڈاکٹر صاحب بھاگے آئے اور آ کر چیک اپ شروع کر دیا کتنی ہی دیر آنکھیں موندے میں اس صورت حال کا جائزہ لیتی رہی- مجھے سمجھنے میں کافی دیر لگی کہ میں اب کے آگے کی کسی منزل کی مسافر تھی شاید عالم رویا میں کسی بزرگ، کسی ولی اللہ یا کسی مقدس ہستی کی زیارت نصیب ہوئی- یہ پانی کا شور کیسا ہے خاتون؟ یہ کلینک دریائے سوات کے کنارے پر ہے- اس کے بہنے کا شور ہے- مجھے باہر کا نظارہ دیکھنا ہے- میں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر بدنی کمزوری کی وجہ سے وہیں گر گئی- اچانک مجھے یوں لگا جیسے کھڑکی کے پاس وہی بزرگ کھڑے ہیں یا ان کا ہیولہ اور شبہ یہ ہے جو میرے دماغ میں تھی- وہ بادلوں کے رتھ پر سوار میرے بستر کے پاس آئے- محبت کے اس پانی کو بہنے دینا، کبھی روکنا مت، تمہیں پانی کی برکت ملی ہے- یوں لگا جیسے جوانی جیسی توانائی میرے وجود میں اُتر آئی ہو- حیرتوں کی چادر بدن پر لپیٹے میں اُٹھ کر کھڑکی تک آئی- باہر دریائے سوات کا نیلا پانی پتھروں سے سر ٹکراتا - بھاگ رہا تھا- میں بھی قطرہ قطرہ پانی میں بہہ رہی تھی- ہلکی پھلکی نرم نرم سی دل کی دنیا میں بدل گئی- وحشتوں کی ساری کدورت نکل گئی - محبت ہی محبت ہے - کسی اَن دیکھی الوہی دنیا کی منڈیر پر کھڑی کسی اور ہی دنیا کو دیکھتی ہوں- اک چپ نے دھیان وعرفان کی دنیا عطا کر دی- سب تلپٹ ہو گیا- سگمنڈ فرائیڈ کے سارے نظریات ان پانیوں میں بہہ گئے- بس محبت خدا ہے اور خدا میرے اندر ہے- میں آبشاروں پر کھڑی ہوں - میرے پیروں کے نیچے مہیب چٹانیں ہیں- غار منہ کھولے سمندروں کو ہڑپ کر رہے ہیں میں بادلوں پر کھڑی حیرت سے دیکھتی ہوں - آبشار میرے پیروں کو بھگوتی ہیں- میں کسی انجانی مستی کی الوہی، نرالی دنیا میں روشنی پر بیٹھی ہوں میرا دل محبت سے شرابور ہے-

☆☆☆☆☆

بشیراں........

بشیراں کا پکا سانولا ہڈیوں پر مڑھا چہرہ ناپسندیدگی سے بینگنی ہوا جا رہا تھا تین دن کے بخار کے بعد آئی تھی تو براہِ راست میرے ہی کمرے کی صفائی کی دھن میں اوپر چڑھی جا رہی تھی میں حسبِ معمول چہرے پر عینک دھرے لیپ ٹاپ دو عدد موبائل چارجر کے جہاں میں نیند کے جہان سے وارد ہو رہی تھی اُس وقت خود کو اگلے زندہ دن سے جوڑنا گزشتہ رات سے علیحدہ ہونے کا مرحلہ ہوتا ہے۔

کرونا سے بچ بچ کے چلی تھی کہ پہلے ہی قطار در قطار پڑے افسانے کالم شاعری ترتیب کے منتظر ہیں اگر صحت اِن سب کاموں کی متحمل نہیں ہو پا رہی تو کرونا کی ٹوٹی ہڈیوں میں کیا ہوگا میں تو کسی کو صحت مند بھی منظور نہیں تو بیمار کو کون پچکارے گا...... صبر مجھ میں اختیاری ہے بڑی مشکلوں سے کرتی ہوں طبیعت بے قرار اور مضمحل پائی ہے بڑی مریض ثابت ہوتی ہوں بہت واویلا دل کرتا ہے اور سننے والا کوئی نہیں ہوتا سارے صحت مند زہر لگتے ہیں پہلا خیال یہی آتا ہے کہ یہ بیماری ان کو کیوں نہیں ہوتی اور تیمارداروں کو بھی دیکھو کر آتے ہیں کہتے ہیں سنا ہے ہارٹ اٹیک ہو گیا۔

استغفار...... ذرا سی تیزابیت اور ان کے خواب دیکھو...... جی نہیں ابھی یہ خوشی آپ سے دور ہے کہ میں بہت ایکسرسائز کرتی ہوں وہ بھی جم میں وہ بھی اپنوں کی نارسائیوں کے کارن......

میں اُس سے بچ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر سٹریچنگ کر رہی تھی...... کے میں سر وچ تیل ڈال دیواں...... بشیراں توں اوتھی ضروری کم کر، تے چھٹی مار......

بشیراں میرے ہی انداز میں بازو ٹانگیں ہلا کر دانت دکھلا رہی تھی اے ویکھو بھلی چنگی، مجھے آئینے میں اُس کے سیاہ چہرے جانشی دہانے میں چمکتے دمکتے دانت دکھائی دیئے...... میرا دیا ہوا سوٹ واقعی اُس پر جھولا بنا ہوا تھا۔ باجی...... ڈسیاں کیکن جے...... کیا...... تہاڈا سوٹ میرے تے...... شرماہٹ نے گھل کر اور بھی اُسے ڈراؤنا کر دیا...... جا نیچے نگینہ تو آکھ تینوں سیب دیوے...... میں نے اُسے پھل پر ٹرخانا چاہا...... اُوشدی تھلے کم کر رہی

صوفیہ بیدار

میں اپنی باجی...... باجی کی کی کہہ ڈساں...... نا دس...... وہ اوپر چڑھی آ رہی تھی میں اس کے قرب سے کھسک رہی تھی...... تریں ڈن تھیں میں آئی شمیم آکھدی تُسی کرہ کیتا...... میں تو ملی نہیں شمیم سے تمھارا بیٹا بتا گیا تھا تم بیمار ہو میں نے کہا ہفتہ بھر گھر رکھو تم چھلانگیں مارتی آ گئی ہو...... او دراصل شمیم...... وہ دانتوں والے دہانے پر ہاتھ کی اوٹ بنائے جھکتی ہوئی چغلی کی سرگوشی میرے کان میں انڈیلنا چاہتی تھی۔ بشیراں کمرے میں کیا اوپری منزل پر کوئی نہیں ''دوروں ای دس'' میں شمالی پنجاب اور وہ جنوبی پنجاب پلس اردو ٹکا رہے تھے۔ او تھیں...... دیواراں دے وی کن...... تسی کے نو ڈسنا ناں...... تو اپنے کول رکھ اپنے فضول راز میں اس کے گزشتہ بخار سے خوفزدہ چھڑا اپی مار بیڈ کے درمیان جا بیٹھی بشیراں اس گریز کو نظرانداز کیے میرے لیپ ٹاپ پر جھے ویڈے دیکھ کر بولی باجی تہاڈی ویڈ...... گھٹ گئی عینکاں لائی ودی جے...... دیکھو میتوں کائی تہاڈے تل رنج تھیں...... پر شمیم...... بشیراں جا تھلے...... بشیراں اُس وقت تو چلی گئی مگر کچھ ہی دیر بعد آدھا بیڈ اکام چھوڑ پھر اوپر نیچے اُس کی بیٹی نگینہ فریج ڈیپ فریزر مائیکرو کی صفائی کر رہی تھی بشیراں سے یہ رسک کبھی نہیں لیا تھا وہ چیزوں کو دانتوں سے نہیں آنکھوں سے کھاتی تھی...... پلکوں سے جیب گن لیتی پوروں سے کیلے، جیم، مکھن......

ہاتھ میں جھاڑن لیے پھر میرے بیڈ روم میں سوار...... میں آکھیا نگینہ نو تلے کر...... باجی دا کمرہ میں آپ کرسی...... تینوں سمجھ نہیں آندی۔ میں بھنا گئی...... آندی اے سب سمجھ آندی اے...... وہ جھاڑن کندھے پر ڈال دھڑام سے کارپٹ کے ٹکڑے پر گوڈے پیار کرنے کے طور پر بیٹھ گئی...... میں اُس کا طنز نظرانداز کر کے بولی اے کمرہ رہن دے...... تھیں میں ''نگینہ نوں آکھ وینڈی...... تساں میتوں بہوں پیار کریسی...... کہتے ہوئے مونالیزا سے مسکراہٹ سے مجھے جلا ڈالا...... تو کیہہ چاہتی بشیراں...... میرے پاس اپنے بچوں کے لیے ٹائم نہیں مجھ پر تو تہمت ہی یہ ہے کہ میں اپنی لکھتوں کو ہی پورا وقت دیتی ہوں تمھاری محلاتی بکواس کیا سنوں...... ٹھیک باجی...... ٹھیک...... ساڈی تاں بکواس ہوندی...... تہاڈا علاقہ خوشحال تُسی خوشحال...... چلو...... یہ نئی مصیبت/ اچھا بکو...... میں کانوں سے عینک اور ہیڈ اُتارنا...... ابھی مکمل بھی نہ کر پائی وہ لومڑی کی سی سُرعت سے میرے کان تک پہنچی...... پراں...... پراں...... میں چیخی کیا مصیبت ہے۔ گھر میں کون ہے وہیں سے سنا...... بشیراں جھاڑن تھام ٹھپ ٹھپ سیڑھیاں اُتر گئی قدرے بلند آواز سیڑھیوں سے آئی نگینہ تو اوپر جا...... باجی نوں میرے ناں پیار بہتا......

یا اللہ میں نے سمجھا تھا میرے حصے کی طرزیں تمام ہوئیں مگر کہاں......؟ یہ طنطنے افراد کے نہیں قسمت کے ہوتے ہیں اتنے انکشافات کل

سے اسی جاہل تک طنز کی کاٹ ایک جیسی ہی تھی...... اور ستانے کا عمل...... میں نیچے باجی کی کتابیں...... نگینہ اوپر آچکی تھی...... نگینہ خدا کے لیے اپنی اماں کو نیچے کہیں پنکھے تلے بٹھا پھل جوس دے...... نگینہ منہ پر کپڑا دھرلی آپ کو تو پتہ ہے وہ آپ کا کام نہیں آپ کی محبت میں آتی ہے بھائی نے کب سے کام چھڑا دیا مگر مانتی نہیں...... اب بچہ بنی آپ کی کتابوں پنسلوں سے چھیڑ اچھاڑی کرے ہے کہ بعد کو بولیں اُس کے جانے کے بعد بھی پسند کا پین ڈھونڈیں بشیراں کو یاد کریں...... ربا...... یہ محبت کیا مصیبت ہے نہ ہو تو ہم بین کرتے ہو...... ہو تو سو آزار......

فریج سے سارے سالن ہاٹ پوٹ سے روٹیاں سبزیوں کی بھی چھانٹ کرکے گھر لے جاتی ہے...... میں نیچے لاونج میں اپنی کتابوں کی دکان لگا بیٹھی تھی کاغذ دستے گتے پین مار کر بھی کچھ تھا چاہتی تھی ان پر میں سے مار دوں مگر بشیراں کی عقابی نظریں دیکھ رہی تھیں۔

"دسّاں ناشتہ کرنا ہوسی...... کیسی نگینہ شدی پر اٹھا بنا دیندی...... سکی ڈبل روٹی دلیہ چھنڈ و پہلے ای "سمارٹ" او...... نالے کیہوں وکھانا...... طنز طنطناتی نیچی آواز میں آئی کہ اُسے پرواز کی ضرورت نہیں ہوتی سرائیت کا محل ہوتا ہے......

نظرانداز کرنے کی پریکٹس اپنی بھی دہائیوں کی ہے...... بس چھٹی کر......

لابی سے نگینہ ہاتھوں میں لفافے پولی تھین تھیلیاں پلاسٹک ڈبے میں قرینے سے پرانی سبزیاں پھل سالن چاول پیک کیے ماہر فوڈ پانڈا کی طرح کھڑی ماں کو پکار رہی تھی چل اماں...... تجھے کہا بھی تھا نجی پر ٹک جا...... پر تجھے چین نہیں یہاں آکر باجی کا سر کھانا ضروری ہوتا ہے میں دانستہ نگینہ کو بدتمیزی سے نہیں روک رہی تھی کہ یہ اُن کے ہاں بدتمیزی ہے بھی نہیں...... بشیراں اُٹھ کھڑی ہوئی ہوکا ابھی اس کے لبوں تک پہنچا تو میرے معدے سے شکرانہ کہ ناشتے کو گیارہ بج رہے تھے...... اور میں انتظار میں تھی یہ جائے تو...... سلائس انڈا جام......

گڑ والی چائے الائچی اور سونف کے ساتھ کہ دن کا آغاز ہمیشہ صاف ستھرے نیم روشن کچن سوئے سوئے سے گھر رات کی ٹھنڈک میں نہائے دلپزیر تنہائی میں...... دیگر بیڈ رومز میں سوئے بچے...... خاموش فرنیچر اور...... اپنا ناشتہ تیار کرنا مجھے کتنا مرغوب تھا کہ پورے دن کا انحصار انہیں اوقات پر تھا یہ وقت بگڑ جاتا تو دن بھر کی دفتری چائے بھی یہ تھکن نہ اتار پاتی...... خیال کی دھند ابھی اتنی گہری نہ ہوئی تھی کہ نگینہ کے ہمراہ لابی کراس کرتی ہوئی بشیراں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ جو گیراج میں کھلتا تھا سے ذرا سا جھانک کر خشمگیں نگاہوں سے کہا......

لو ہن کرلو...... ناشتہ......

☆☆☆☆☆

گواہی

شمینہ سیّد

" میں محبت کے سحر میں ہوں اپنے آغاز سے ہی- جب سے مجھے اپنی سمجھ آئی تب سے ہی وہ میرے ساتھ ہے- مجھے اس کے قدموں کی چاپ تک سنائی دیتی ہے - میرے قدم ایک دم رُک جاتے ہیں- ایسا لگتا ہے وہ بلا رہا ہے مجھے- اس نے آواز دی ہے- اک شناسا سی خوشبو میری نس نس میں اترنے لگتی ہے- جو اوائل جوانی کے دنوں میں سما گئی تھی - وہی تھا—— جس کے پرفیوم کی خوشبو میرے حواسوں پر طاری رہتی تھی- جیگوار کلاسک بلیک ---- میری تخیل کرتا -- وہ نہیں بھی ہوتا تو مجھے ساتھ ہی محسوس ہوتا- میری پہلی محبت، وہ شخص میری کچی عمر کی چاہت- اس کے بعد میری آنکھیں کچھ اور دیکھنا بھول گئی تھیں -- دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں ---- شاید

لیکن- وہ بھی نظر نہیں آتا مجھے- ہمیشہ اس کا لمس چھو کر گزر جاتا ہے وہ جو میری پہلی خوشی، پہلی محبت، پہلا گناہ ----- جو آخری بھی ثابت ہوا ہے- جب سے اس نے میرے بدن کو چھوا تھا میں تب سے ہی پتھر ہوگئی تھی - کبھی کبھی تو میں گھنٹوں نہاتی- ایک عجیب طرح کا مجرمانہ احساس

مجھے گھیر لیتا۔اور کبھی ۔۔۔۔وہ خوشبو بن جاتا۔۔۔مجھے مست کر دیتا۔ میں گناہ اور ثواب کے چکر سے نکل جاتی۔۔۔بس اس کا پیار بھرا لمس رہ جاتا میں مٹ جاتی۔" میں سانس لینے کے لیے رکی۔پانی کے دو گھونٹ حلق سے اتارے۔

میری نظریں کھڑکی کی طرف اٹھیں۔ گلی کے نکڑ تک اسی کو ڈھونڈتی رہیں روز کی طرح۔۔۔میری نظریں مایوس نہیں ہوتی تھیں،اور امید ایسی کہ مجھے ملنے ہی نہ دیتی کبھی بھی نہ ٹوٹتی۔۔ایسے میں امی کی آواز سماعتوں میں تازہ ہو جاتی۔

"زمرہ تو پھر کہیں گم ہے، سوچتی ہوں کسی اچھے عامل کو تجھے دکھا لاؤں نجانے کیسا روگ میری بچی کی جان کو لگ گیا ہے۔"

بیچاری امی۔۔۔ ماں تھیں ناں۔۔۔ شکر ہے۔۔۔جان نہیں پائیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ نہ جاننا ان کے لیے بہت بہتر ہوا۔۔۔اور وقت گزر گیا۔ ساری دھول میرے منتظر بدن پر ڈالتا ہوا۔۔ میرے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ امی ابا میری شادی کے لیے ضد کرتے کرتے زندگی سے ہار گئے۔ اب میں اکیلی تھی اور بہت مشہور و معروف شخصیت بن چکی تھی۔ لیکن وہ وہیں تھا۔۔۔میرے اندر بیٹھی چھوٹی سی نوعمر لڑکی کو صندل کر کے جانے والا۔۔۔ وہیں رہتا تھا اس لڑکی کے بدن میں"۔

"وہ کون تھا ویسے؟" شہزل نے سوال کیا۔وہ سوال پر سوال کر رہی تھی۔ یہی کچھ کرنے آئی تھی۔

"کون؟" میں حسب عادت چونکی۔

"وہی جس نے تجھے دیوانہ کر رکھا ہے، تجھے نہیں لگتا بہت وقت بیت گیا۔ سب کچھ بدل گیا،تو بھی بدل جا اب۔ کتنے کام کیے ہیں تو نے زندگی میں۔۔۔اتنا اضطراب تیری جان لے لے گا۔"

میں اسے کیا بتاتی وہ تو آئینے میں جما رہتا تھا۔فریب ہو شاید۔۔۔۔۔ شام کے جھٹپٹے کا طلسم ہو شاید۔۔ جاڑے کی اداس راتوں کا سرسراتا ہوا کوئی پراسرار سایہ ہو شاید۔۔ میں نہیں جانتی۔ آسیب ہو شاید۔ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔ہاں اتنا جانتی ہوں وہ میری روح میں حلول ہے۔

میں بولنے لگی"۔ کالج کے دنوں کی بات ہے۔اس کا کالج میرے کالج کے بعد آتا تھا وہ روز ہی میرے ساتھ ساتھ چلتا۔ کبھی ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا۔ میں سرخ پڑ جاتی تو مسکرا کر آگے بڑھ جاتا۔ وہ خواب جیسے لمحے دل پر نقش ہو رہے تھے۔ کچی عمروں کے پکے نقش۔"

"کبھی بات ہوئی تھی؟ کسی قسم کے عہد و پیمان؟" شہزل کے سوال پر میں نے ذہن پہ زور ڈالا۔

"نہیں۔۔ عہد و پیمان نہیں۔۔ لیکن یقین

ہے وہ، حقیقت ہے وہ ---ہاں میرے ہونے کی واحد گواہی ہے وہ۔ جس نے مجھے چھو کر مکمل کیا تھا۔ اس نے خاموشی سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا ایک دن-- تب سے اب تک میں وہ ہاتھ جھٹک نہیں سکی میں -------کچے کچے خاک اڑاتے راستوں پر کم سن آنکھوں میں حیرانی بھری ہوئی تھی---- کانوں کی لوؤں سے الجھتی سرگوشیاں - گھنگھریالے بالوں کی لٹیں، ناک پہ چھوٹا سا تل- ہاتھوں میں اس کے ہاتھ ------جلا دینے والا لمس -----مجھ میں جاگتا رہتا ہے- جلاتا رہتا ہے اور میں اسی میں جل کر راکھ ہوگئی ہوں- تب یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا تھا- لیکن اس نے مجھے خود میں چھپا لیا تھا- روح کی محبت کو بدن میں اتار دیا تھا- پھر ایک دوسرے کے ہونے کا احساس روز تن بدن میں، روح میں جاگنے لگا- ہم سرتاپا گناہ بن گئے تھے- ہوائیں اڑائے لیے پھرتی رہتی تھیں- اس نے مجھے چھو کر پتھر بنا دیا تھا یا کہ پارس----اب بالوں میں اترتی چاندی کے ساتھ بھی میں وہیں کھڑی ہوں جہاں وہ تھا میرے ساتھ- میں جاگتی ہوں اور یہ سٹریٹ لائٹ"- میں نے باہر کی طرف اشارہ کیا- سانس آزاد کیے پھر بولنے لگی-

"میں اسے محبت سمجھ بیٹھی- پھر میں محبت کے اس فریب میں دانستہ رہی- کیونکہ وہ تو بغیر بتائے کہیں چلا گیا تھا- شاید اس کے گھر والے اسے محبت کے اس جنون سے بچا کر لے گئے- شاید انہیں کچھ پتہ چل گیا ہو- یا پھر وہ-- خود چلا گیا---اس کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی اس کھلونے میں--میں نہیں جانتی وہ کہاں گم ہوگیا- بہت دن میں نے دیوانوں کی طرح اسے سڑکوں پر، راہداریوں میں، گلیوں میں ڈھونڈا، اور پھر آج تک میں اسے ڈھونڈ رہی ہوں-"

میری آنکھوں میں دھواں بھرنے لگا تو بیٹھنا محال ہونے لگا- بولتے بولتے میری سانسیں پھولنے لگیں-

شہزل جعفری میری مداح تھی- میری کولیگ کی چھوٹی بہن- لیکن میری دوست بن گئی تھی- گہری دوست- نوجوان صحافی تھی- میرا انٹرویو کرنا چاہتی تھی بہت دنوں سے وقت مانگ رہی تھی-

میں نے گھر بلا لیا- زخموں سے کھرنڈ اترنے لگے- میں نے کہنا شروع کیا-

" آج جو میں معروف مصورہ، شاعرہ اور افسانہ نگار ہوں- میں زندگی کے فلسفے کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے مزید الجھ جاتی تھی ان دنوں- نظمیں انہی دنوں میرے اندر سے پھوٹنے لگی تھیں- ٹوٹی پھوٹی نظمیں آہستہ آہستہ سنورنے لگیں - کانٹ، ہیگل، افلاطون، ارسطو اور نطشے مجھے تحریک دیتے، جگائے رکھتے- میں ان کے فلسفے کے

مطابق میں شہر سے نکال دیئے جانے کے لائق تھی۔ محبت کر رہی تھی، شعر کہہ رہی تھی، لمس زدہ تھی، گناہگار تھی۔ میں نقل کی نقل کر رہی تھی۔ کائنات جو محبت کی بنیاد پہ ایستادہ ہے۔ اور میں جو نجانے کب سے محبت کر رہی ہوں میرا ہر فلسفہ اسی پر تمام ہوتا ہے۔ ہر نظم اسی لمس پر جا ٹھہرتی ہے۔ میں گھبرا کر کتابوں میں پناہ ڈھونڈتی رہتی ہوں۔ یہ نظمیں اور افسانے نہیں ہیں فرار ہے۔ اب تک میری تلاش کو ٹھکانہ نہیں ملا۔ تو لکھ رہی ہوں۔ بس یہ میری حقیقت ہے۔ تم یہ سب لکھنا، سب چھاپنا۔۔۔ لڑکیوں کو بتانا کہ محبت روگ بن جائے تو زندگی موت بن جاتی ہے۔

ملٹن اور شیلے کی نظمیں مجھے زمین سے اٹھا کر ماورا کر دیتی تھیں۔ انمول اور نایاب بنا دیتی تھیں۔۔۔ غالب۔۔ فیض۔۔ پروین شاکر، سارہ شگفتہ کے وادیلے اور فہمیدہ ریاض کی بیباکی مجھے سہارا دیتی تھی۔ میرے بدن سے نکل کر میری تصویروں میں اترتی رہتی۔ میں لکھتی رہتی، دوڑتی رہتی، ہانپنے لگتی۔ میں نے اس کے سایے کے ساتھ نبھا کرنے کا سوچا تھا تو کیا۔ کر رہی ہوں۔ دیکھ لو شہزل۔ مجھے کوئی دوسرا مرد چھو ہی نہیں سکتا بچپن میں میرے پورے وجود کو جو "سٹیچو" کر گیا تھا میں اسی حالت میں ہوں۔

"یار تو نے خود کو برباد کر لیا ہے۔ وہ تو بھول چکا ہوگا۔ اس کی اپنی خوش باش زندگی ہوگی۔"

شہزل نے کہتے ہوئے چائے کا خالی کپ رکھا۔ وہ لمبا چوڑا انٹرویو کر چکی تھی۔ ایک معصوم محبت سے ہاری ہوئی لڑکی سے لے کر آج کی معروف مصورہ، ادیبہ اور شاعرہ کے راز تک اس نے میرے ساتھ سفر کر لیا تھا۔ میں نجانے کیا کر رہی تھی۔ اپنے جیسی لڑکیوں کو ڈرا رہی تھی، پچھتاوے اور تھکن بول رہی تھی یا پھر واقعی یہ محبت تھی۔ اپنا پیغام میری اپنی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ مسلسل مجھے سمجھاتی رہی۔ میرے ہاتھ پیار سے دبانے لگتی۔ پھر جانے کے ارادے سے اٹھی۔ اپنے اخبارات سمیٹنے لگی۔ تبھی ایک اخبار نیچے گر گیا۔۔ وہ اخبار کی شہ سرخیوں میں ابھر آیا۔ شاید میری دیوانگی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر چھوا۔۔ آج عجیب ہوا۔ میں نے اخبار پر انگلی رکھی تو اس کی تصویر نے میری انگلی کو چھوا۔ یہ خواب نہیں رہا تھا۔ وہ وہی تھا۔۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے تھے اور شخصیت مزید نکھر گئی تھی۔ ناک کے تل نے تو مہر ثبت کر دی۔ میں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کے جیگوار کلاسک بلیک کی خوشبو پھیل گئی۔

شہزل بھی زمین پر بیٹھ گئی۔ "کیا ہوا زمرہ۔۔۔ زمرہ۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟"

"یہ عماد ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ وہی ہے۔۔۔ شہزل۔۔ وہی

میرا محبوب، میری تپسیا۔۔ جس کی میں منتظر ہوں سالہا سال سے۔"

"پاگل ہو تم؟" وہ پوری قوت سے چلائی۔

"یہ بندہ ضماد چوہدری ہے زمرہ، اس نے اپنی بیوی کو بدچلنی کے شبے میں قتل کر دیا ہے اور سننے میں آ رہا ہے یہ مقتولہ ثمرہ اس کی تیسری بیوی ہے۔ پہلی دونوں نے خودکشی کی تھی۔ لیکن میرا سوچنا ہے اسی سفاک انسان نے ان کا قتل کیا ہوگا۔ اس کے گھر والے کہتے ہیں یہ ذہنی مریض ہے۔۔ نہیں نہیں یہ تو ان بڑے لوگوں کی سزا سے بچنے کے لیے ایک توجیہہ ہوتی ہے۔ کیس لٹکانے کی جھوٹی وجہ۔"

شہزل بول رہی تھی اور میری آنکھوں سے میری زندگی کے قیمتی ماہ و سال گزر رہے تھے۔ بہت تیزی سے جھکولے چل رہے تھے۔۔۔۔ عورت محبت کے دھوکے میں جیتی ہے اور اسی دھوکے میں موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ محبت نے مجھے بہت کمزور کر دیا تھا۔ مجھے بڑے زور کی ابکائی آئی۔۔۔۔۔ سارے فرش پر خون کے فوارے الٹ پڑے۔۔۔۔ ایسے شخص کو میں نے سالہا سال چاہا تھا۔۔۔۔ ابکائی پھر آنے لگی پھر خون تھوکنے کے بعد میں سنبھلی۔۔ جلدی سے اٹھی، بال سمیٹے۔ خود کو سنبھالا۔۔۔ درازوں سے بلڈ پریشر کی دوا ڈھونڈ کر جلدی سے پھانکی۔ بہت سارا پانی پیا۔

مدت سے یہ الجھی ہوئی گتھی نہیں سلجھی
وہ مجھ میں سمایا تھا تو بے گھر ہوا کیسے؟

....

"شہزل تو کیا وہ عادی مجرم تھا؟ تو کیا اس نے میرے بدن سے بھی عادتاً کھیلا؟ اور میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم مجھے ابھی ہاسپٹل لے چلو، جلدی۔۔۔ میں اس شخص کو جانتی ہوں صرف میں ہی یہ ہمت کر سکتی ہوں۔ میں ہی اس کے خلاف واحد گواہی ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ اس بچی کے جذبات کا قتل جو اس نے کیا تھا۔ وہ بھی اس کی فہرست میں ہے۔ ہو سکتا ہے سرِفہرست نہ ہو۔۔۔ لیکن اس بچی نے تو اسے پہلی محبت سمجھا۔۔ آہ میری ساری زندگی۔۔۔۔ چلو مجھے جلدی لے کر چلو شہزل۔۔۔ مجھے بچا لینا. میں ثابت کروں گی کہ عورت کمزور نہیں ہوتی۔ محبت بھی کمزور نہیں بنا سکتی اسے۔"

میں نے پیروں سے کیتوس ہٹائے، انتظار کو بانہوں میں سمیٹا۔۔۔ دروازے سے باہر پھینکنا تھا اسے، بس بہت ہو چکا۔۔۔ رائیگانی سی رائیگانی ہے۔۔ لیکن فرض مجھے اس احساس سے کھینچ کر باہر لے آیا"۔ وہ جو میرے ہونے کی گواہی تھا اب میری گواہی اس کی موت بن جائے گی" میں نے خود کو بڑبڑاتے ہوئے، بددعا کرتے ہوئے سنا۔

☆☆☆☆☆

دیہاتی زندگی: دُور کے ڈھول سُہانے

دیہاتی طرزِ زندگی کی تعریف میں رطب اللسان حضرات شاید اس کے دوسرے پہلو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے دیہی معاشرت سادہ، حقیقی اور بناوٹ سے کافی حد تک پاک تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس معاشرت کا خاصہ تھیں اور کچھ اُن لوگوں کی اپنی پیدا کردہ تھیں۔ اُن کی صفائی ستھرائی کے معیارات کو آج کل کی Highgeinic Conditions پر پرکھا جائے تو کافی گڑبڑ نظر آتی ہے۔ مثلاً گھروں کی ''آرائش و زیبائش'' کے لیے گوبر کا استعمال عام تھا (اور کافی حد تک ابھی بھی ہے)۔ موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی کچے گھروں کے صحنوں اور دیواروں پر چکنی مٹی اور گوبر سے لیپائی کی جاتی ہے۔ گوبر میں اسی قبیل کی کچھ اور ''نفیس'' چیزیں ملا کر مرکب تیار کیا جاتا ہے اور پھر اس سے صحن اور دیواروں پر نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ اس کام کے لیے دیہاتی خواتین میں شوق، لگن اور مقابلہ دیدنی ہوتا تھا اور اس کا اظہار صبح صبح مال مویشیوں کے باڑے کے باہر ان کے رش اور بعض اوقات چھینا جھپٹی سے ہوتا تھا۔ سجاوٹ کے علاوہ بھی گوبر کے کئی 'مفید' استعمالات ہیں، جن میں اسی سے اُپلے تھاپنا بھی شامل ہیں جو ایندھن کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُپلوں کا استعمال اب قدرے کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک زمانے میں گو گاؤں کا کوئی مکان، چھت یا دیوار ایسی نہیں ہوتی تھی جو ان سے ''آراستہ'' نہ ہوتی ہو۔ یہ ناچیز ایک دیہاتی ہے اور اس نے کئی دفعہ گاؤں میں اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے (جو اتنی گنہگار بھی نہیں ہیں) کہ بعض خواتین چولہے میں اپلوں کی ''ایڈجسٹمنٹ'' کرنے کے ساتھ ساتھ عین اسی لمحے روٹی بھی پکا رہی ہوتی ہیں۔ ایسے میں ایک ہاتھ میں روٹی اور دوسرے میں اُپلہ تھاما ہوتا ہے۔ (اور بعض اوقات تو ہر دو کاموں کے لیے ایک ہی ہاتھ استعمال کیا جاتا ہے)۔ ذاتی طور پر ہمیں گوبر کے ان استعمالات سے

ناصر محمود ملک

ہمیشہ نظریاتی اختلاف رہا۔ اور کئی دفعہ ہم نے گاؤں والوں کو بڑے خلوص سے یہ سمجھانے کوشش کی ہے کہ مال مویشی کے فضلے خصوصاً گوبر کے استعمال کے بغیر بھی انسانی معاشرہ برقرار رہ سکتا ہے اور کچھ معاشروں نے تو اس کا باقاعدہ عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ لیکن الحمدللہ، ہماری بات کبھی نہیں سُنی گئی اور ہم نے ہمیشہ منہ کی کھائی ہے۔

آجکل دیہاتوں میں بھی ترقی کے آثار نظر آتے ہیں۔ شہری زندگی کی چھاپ کی بنا پر کئی دیہاتوں پر اب تو شہروں کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن ستر اسّی کی دہائی تک حالات یکسر مختلف تھے۔ کوالیفائیڈ ڈاکٹر تو خیر اب بھی یہی علاقوں میں کم ملتے ہیں لیکن اس زمانے میں ڈاکٹر تو کُجا کوئی ڈھنگ کا Quack بھی موجود نہیں تھا۔ ایسے میں کہیں کسی 'نان کوالیفائیڈ' اور بے مُرشدے Quack کا موجود ہونا بھی غنیمت تھا۔ گاؤں کے ڈاکٹر کمال کے لوگ ہوتے تھے۔ کوئی عمر رسیدہ مریض اگر دس پندرہ دن کے 'علاج' کے باوجود بھی ٹھیک نہ ہوتا تو اگرچہ وہ زکام بخار وغیرہ کا ہی مریض ہوتا یہ اُسے اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر پورے خلوص کے ساتھ ''جواب'' دے دیتے۔ اور ورثاء سے کہتے کہ بس اب ان کی ''خدمت'' کریں اور دعا کریں۔ مریض بے چارہ اس پر بھی خوش ہوتا کہ چلو اس 'بہانے' کچھ خدمت تو ہوگی۔ میڈیکل سائنس میں ترقی ہوئی تو گاؤں میں اس ترقی کا حصہ صرف ''سٹیرائیڈز'' کی صورت میں پہنچا۔ چنانچہ گاؤں کے ڈاکٹر سٹیرائیڈز کا بے دریغ استعمال کرواتے ہیں۔ اکثر ان کا طریقہ علاج بڑا عجیب ہوتا ہے۔ بات ''ڈیکا ڈران'' سے شروع ہوتی ہے اور ''مرن مران'' پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور درمیانی فاصلہ اتنا کم ہوتا ہے کہ ''فریقین'' کو گلے شکوے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

ایک اور مسئلہ پانی کا استعمال تھا۔ پانی کے جُملہ استعمال کے لیے ''کھوہ'' (کنواں) واحد ذریعہ تھا۔ انسان، مال مویشی چرند پرند..... سب یہیں سے پانی پیتے۔ کھوہ سے پانی نکالنے کے لیے مٹی کے لوٹے استعمال ہوتے۔ کھوہ والے اکثر اس میں اُتر کر ٹوٹے ہوئے لوٹوں کو باہر نکال کر پھینکتے رہتے۔ (ہمارے ہاں ''لوٹوں'' کی اصل قدر و قیمت قدرے دیر سے معلوم ہوئی ہے) بعض اوقات کوئی جانور از قسم کتا، گدھا وغیرہ کنویں میں گر جاتا جسے اس کی مرضی کے بغیر باہر نکال کر پانی استعمال کیا جاتا۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ اس وقت سامنے آتا جب برسات کے دنوں میں کھوہ

کے پانی میں ''کورے'' (باریک کیڑے) وافر تعداد میں موجود ہوتے۔ ان دنوں پینے کے لیے اس پانی کا استعمال ایک گھمبیر مسئلہ بن جاتا۔ برسات کئی دیگر معاملات میں بھی ان لوگوں کے لیے مسائل پیدا کرتی تھی۔ کچے مکانوں کی وجہ سے یہ بارشوں سے دوستی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہر برسات کچے گھروندوں مکانوں اور چھپر کوٹیوں کے لیے ایک چیلنج کی مانند ہوتی۔ برسات کے پیدا کردہ بعض مسائل تو بالکل ہی ناقابلِ بیان ہیں۔ یہ لوگ حوائج ضروریہ کے لیے گھروں سے باہر جایا کرتے تھے۔ ایسے میں برسات ایک الگ قسم کا چیلنج بن کر سامنے آتی۔ موسمِ سرما کی کسی یخ بستہ رات یا برسات کی بھرپور بارش میں ان مقاصد کے لیے گھر سے باہر نکل کر کھیتوں کا رُخ کرنا Herculean Task کے مترادف تھا۔ ایسے میں ''نیچر کی کال'' بڑی Unnatural لگتی۔

اُن دنوں کی دیہی معاشرت کو ہم لاکھ آئیڈیلائز کر لیں لیکن اوپر بیان کردہ مسائل اور ان کے علاوہ کچھ دیگر معاملات کو بہر طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً موسمِ سرما میں صبح سویرے گیلی لکڑیوں سے آگ جلانا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ چولہے پر دھری ہانڈی کے نیچے ''دھونی'' میں پھونکے مار مار کر آگ جلانے کی کوشش میں بندہ ''پھانواں'' سا ہو جاتا۔ ایسے میں اُپلوں اور لکڑیوں کی راکھ اُڑ اُڑ کر چہرے اور آنکھوں میں پڑتی اور باقی ہنڈیا میں ڈل کر کھانے کا حصہ بنتی۔ آجکل کچن میں لگے 'کوکنگ رینج' کو لائٹر کی مدد سے چلایا جاتا ہے اور اپنی مرضی کی حرارت پر ایڈجسٹ کیا جا سکتا ہے۔ اُس زمانے میں جب گاؤں میں بجلی وغیرہ کا تصور بھی نہیں تھا تو شدید موسم گرما کی اُس جان لیوا حبس کے عالم میں کہ جس میں لُو چلنے کی دعائیں مانگی جاتیں، لوگ ساری رات مچھروں اور حبس سے جنگ لڑتے رہتے اور رات یونہی آنکھوں میں بیت جاتی۔ دوسری طرف ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے آجکل ایسے موسم میں لوگ ایئر کنڈیشنڈ، ائرکولر، پنکھا، حسبِ استطاعت۔ کچھ بھی لگا چلا کر رات آرام سے گزارتے اور میٹھی نیند سوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی کچھ لوگ اگر اُس زمانے کی دیہاتی زندگی کے گُن گاتے اور اُسے "Romanticise" کرتے ہیں تو یہ ان کا اپنا خیال ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ خودکشی وغیرہ بھی تو ہمارے جیسے انسان ہی کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ادبی خط

مکرمی شہاب الدین چراغ صاحب

تسلیمات!

اسلام آباد کی سرکاری اور اور جانبدارانہ تقریب کا کوئی اور فائدہ ہوا ہے کہ نہیں، لیکن میرے لیے یہ بہت بڑی سعادت تھی کہ پندرہ برس بعد آپ سے ملاقات ہوگئی۔ ہمارے درمیان فاصلے اور بے تعلقی کی درجنوں وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے میری طرف سے زیادتی کا عنصر کئی گنا زیادہ ہو۔ لیکن آپ کی ترجیحات کا بھی کچھ تو اثر ہوگا۔ ظاہر آج آپ جس مقام و مرتبے پہ ہیں اس تک پہنچنے میں آدمی کو مجھ جیسوں کی کئی مرتبہ قربانی دینی پڑتی ہے۔ بشری برائیاں استعمال کر کے آدمی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ باقی یہ جو ہماری معاشرتی اور اخلاقی کتابوں میں خودداری، عبرت بے نیازی، قناعت، درویشی، وضع داری، روشن ضمیری، خود آگاہی، شائستگی، بلند کردار، آزادی فکر وغیرہ کے الفاظ ہیں۔ یہ محض زبان سے ادا کرتے ہوئے نہ صرف لہجے کو خوبصورت بناتے ہیں۔ بلکہ سنتے ہی بڑے دلکش آواز پر اثر ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں صرف کہنے ہی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو انہیں زیادہ استعمال کرتا ہے وہ عام طور پر ان اوصاف سے محروم ہی دیکھا گیا ہے۔ ہمارے اُردو ادب معاشرتی نفرت بغض، تاریخی و سیاسی پستی، خوشامد، منافقت، بزدلانہ دُعاؤں، حریفانہ وارداتوں کے عناصر نمایاں ہیں۔ آپ برا نہ مانیے گا۔ میں اپنا ذاتی محاسبہ کرتے ہوئے سچائی بیان کر کر کے آپ کی نظر میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے آپ سے صرف یہ گلہ ہے کہ جب بھی میں نے اپنی ذات کا مذاق اُڑایا ہے آپ نے اسے اپنی شخصیت پر حملہ سمجھتے ہوئے کسی نہ کسی طرح انتقام ضرور لیا ہے جسکے نتیجے میں ہمارے درمیان پندرہ سال کینے اور کمینگی ہی میں گزر گئے۔ آپ عمر کے جیسے حصے میں ہیں اُسے واپسی کہتے ہیں۔ میں بھی اس عمل کے مرحلے سے گزر رہا ہوں۔ جو کچھ پایا اور جو کچھ بوجھ تھا اُسے راستے ہی میں پھینک کر واپسی کا سفر آسان اور پرسکون بنایا جاسکتا ہے۔

اُمید ہے آپ میرے بارے میں اپنا دل

کلیم خارجی

ودماغ اس حقیقت کی بنا پر صاف رکھیں گے۔ کہ میں نے کبھی آپ کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اور نہ ہی کبھی میری وجہ سے آپ کا کوئی نقصان ہوا ہے۔ آپ نے اگر مجھے کہیں گزند پہنچانے کی کوشش کی ہوگی تو یہ آپ کی غلط فہمی اور بدگمانی ہوگی۔ اور آپ نے مجھ کوئی صاحب ثروت خوش قسمت یا قابل ترین آدمی سمجھ لیا ہوگا۔ حالانکہ میں نے آپ کو یقین دلایا تھا۔ آپ نے کئی مرتبہ دوستوں کی محفل میں میرا مضحکہ اُڑا کر تسکین حاصل کی تھی۔ آپ میرے حُلیے کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ منظور حادی کو گنجے سر کی طرف سے دیکھیں تو گول انڈہ اور منہ کی طرف سے دیکھیں تو بیلچہ لگتا ہے۔ گویا کہ بیلچے پہ انڈا پڑا ہوا ہے، جبکہ میری اپنے بارے میں پختہ رائے یہ کہ میرا سارا منہ چوکور ہے، خالی چوکھٹے کی مانند ہے جس میں کسی کا منہ بھی فٹ کیا جاسکتا ہے۔ ایک ادبی تقریب میں جب میں نے یہی بات کہی تھی تو آپ نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ میں نے آپ کے معترضین کی ہاں میں ہاں ملائی ہے جن کا متفقہ بیانیہ یہ تھا کہ آپ کی کتاب، گریبان کے دھاگے، ن۔ م۔ راشد، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور آفتاب اقبال کی نظموں کے صریح چربے ہیں۔ لیکن آپ کے نصیب میں عزت اور نیک نامی لکھی تھی۔ اس کتاب پہ آپکو سرکاری انعام بھی ملا۔ اور چند خواتین سکالرز نے ایم فل کے تحقیقی مقالے بھی لکھ مارے تھے۔ اب میں آپ کی عظمت اور ادبی مرتبے کا قائل ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ وہ چراغ ہیں جسے پھونکوں سے بجھانے والے اکثر ناکام ونامراد ہی رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو کبھی میری دوستی اور تعلق کے زمانے کا کوئی دُکھ اور پچھتاوا نہیں رہا ہوگا۔ بات دہرانی پڑ رہی ہے کہ میں نے کبھی آپ سے قرض مانگا اور نہ ہی زندگی کے کسی مشکل وقت میں آپ کی مدد حاصل کی۔ نہ ہی کبھی کسی دُکھ کے مرحلے میں آپ کی یاد آئی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کہ میرے اور آپ کے درمیان کا انسانی اور اخلاقی رشتہ قائم تھا۔ کہ جس کی اب تجدید ہوسکتی ہے۔ ان سطور کو لکھنے سے میرا مقصد آپ کو اپنی طرف سے عزت وتکریم کا لائق سمجھنا ہے۔ اور اس بات کا اعادہ کرنا ہے کہ میری زندگی کی کسی تلخی اور محرومی میں آپ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ کہ مجھے آپ سے کوئی رنج یا گلہ ہو۔ جب مجھے آپ سے کوئی تکلیف ہی نہیں پہنچی تو آپ کو اچھا اور اپنے سے بلند درجہ انسان سمجھنے میں مجھے کیا تامل ہوسکتا ہے۔ آپ نے مجھے تقریب میں دیکھ کر بے پناہ حیرت اور ہلکی سی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ ظاہر ہے مجھ جیسا گمنام اور بے مایہ لوگوں کو ایسی تقریبات میں کون مدعو کرسکتا ہے۔ واقعہ یوں کہ گزشتہ تین دن سے میرے اور شاید

آپ کے بھی ممدوح اور محترم پروفیسر نادر علی میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کہ اُنھیں سرکار کی طرف سے بلاوا آ گیا کہ وہ اس تقریب کی صدارت فرمائیں گے۔ چنانچہ مجھے اُنھیں اسلام آباد پہنچانا پڑا۔ اُنھوں نے مجھ سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ میں اُنھیں جہلم تک چھوڑ کر آؤں گا۔ گاڑی سے اُترتے وقت وہ اپنا موبائل فون سیٹ پہ ہی بھول آئے تھے۔ بار بار اُنھیں کالز آ رہی تھیں۔ چنانچہ میں موبائل اُنھیں دینے گیا تو اُنھوں نے زبردستی چند لوگوں کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا، اسے بھی یہاں کہیں بٹھا کر اس پہ نظر رکھو۔ ہم اکیلے ہی کیوں بور ہوتے رہیں بھیا۔ دیکھنا بھاگ نہ پائے، میزبانوں نے مجھے محترمہ زینت آرا کے پہلو میں جا بٹھایا۔ میں چپ سادھے تماشائی بنا رہا۔ بڑے نامور اور ممتاز ادیبوں اور پروفیسروں نے جھک جھک کر اُن سے جو باتیں کیں۔ حیرت اور دلچسپی سے سنتا رہا اور سر دُھنتا رہا۔ اُن کی شائستگی، برداشت اور بے تکلفی کو سہارا بنا کر کتنے ہی نام نہاد مہذب ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے اندر کے ڈھکنے کھول دیئے تھے ڈائس پر آ کر کسی نے کیا کہا نہ میں نے دیکھا نہ سنا۔ خود محترمہ بھی تقریب کے اندر خود ایک تقریب بنی محظوظ ہوتی رہیں۔ کئی فحش جملوں کا جواب اُنھوں نے بھی نہایت بے باکی سے دیا۔ ایک انتہائی بے ہودہ شاعر کے شعر کا جواب دیتے ہوئے وہ دھڑلے سے بولیں، بھئی میں نے اپنے شوہر کو جس حالت تک پہنچایا۔ اُسے دیکھ کر دُنیا کا کوئی مرد سوائے گفتگو کے مجھ سے کچھ اور کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتا، تم سب زبانی جمع خرچ کے نکمے لوگ ہو۔ تقریب کب ختم ہوئی۔ مجھے احساس تک نہ ہوا میں نے اس تقریب میں آپ کو پانے کے ساتھ ساتھ ایک نئی بات سیکھی کہ پڑھے لکھے مہذب اور باوقار لوگ جب گرتے ہیں۔ تو پستیوں میں گرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اُمید ہے آپ اچھی یادیں لے کر واپس گئے ہوں گے۔ آپ نے حسبِ عادت اپنے بارے میں کچھ ایسا نہیں بتایا کہ ہماری آئندہ کبھی ملاقات ہو سکے۔ آپ نے اپنی نئی کتابیں بھیجنے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن نہ تو آپ نے میرا فون نمبر طلب کیا۔ نہ گھر کا ایڈریس۔ ڈاکٹر عبدالغفور صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ چراغ صاحب آج کل جامعہ لاہور میں اعزازی پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ اور ہفتے میں دو کلاسیں پڑھاتے ہیں۔ میرے لیے یہی پتہ کافی ہے ویسے بھی آپ مشہور و معروف آدمی ہیں۔ میرا خط آپ تک پہنچ ہی جائے گا۔ آپ نے اگر مجھے ڈھونڈنا چاہا تو کیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۔

آپ کا دوست، خیر خواہ

منظور حاوی

۱۴ اگست ۲۰۰۰ء

☆☆☆☆☆

خالد احمد

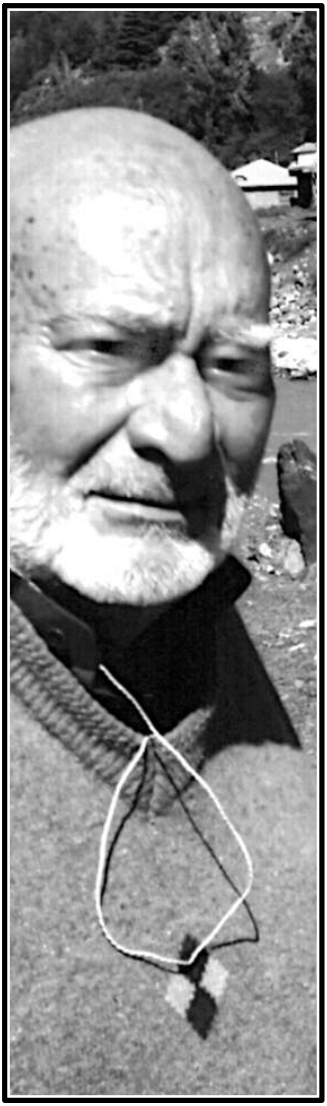

آنسو بن کر آنکھوں میں لہراتے ہو
خالد احمد یاد بہت تم آتے ہو

شعر تمھارے شانِ ورق ہو جاتے ہیں
دادِ سخن کیا اہل ادب سے پاتے ہو

نظم سے اپنی بزم کے شاعر ہو جاؤ
اپنی غزل سے محفل کو گرماتے ہو

بول تمھارے حرفِ دعا ہو جاتے ہیں
حمد و نعت پہ ایسے نین لنڈھاتے ہو

کون یہ جانے لفظ تمھارے کیسے ہیں
کون یہ سمجھے شعر میں کیا کیا لاتے ہو

ہر اک پڑھنے والا تم سے پیار کرے
ہر اک سننے والے کے من بھاتے ہو

ثاقبؔ کا معیار بیاض رسالہ ہے
اس میں تم احباب کے سنگ ہو جاتے ہو

آصف ثاقب

سعادت حسن منٹو

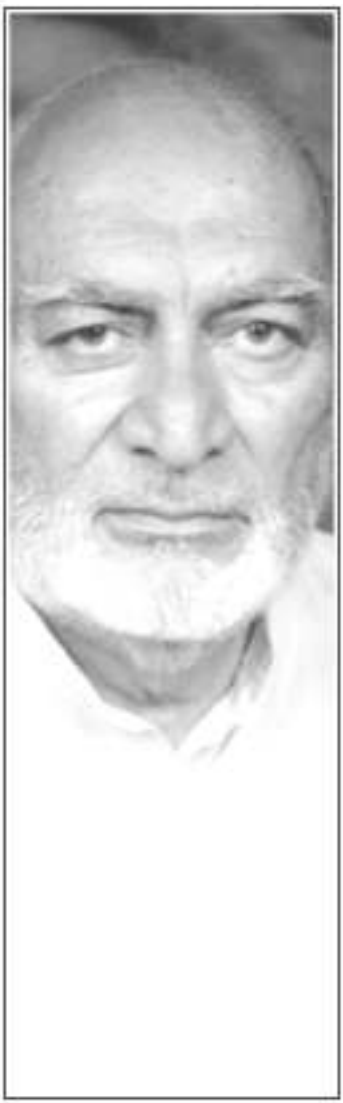

آصف ثاقب

نئے دکھ نئے صدمے
یہ راتیں یہی گھاتیں
کہ یہ رت جگے اپنے
مصیبت ، اذیّت ہیں
زیاں ہے جو دل کا وہ
لکھو تم وہ کیسے جب
کہاں سے ملیں گے لفظ
دلی کرب کیا لکھّوں
لکھائی ہوئی مشکل
تمھیں یہ نصیحت ہے
فسانے پڑھو ثاقب
ملیں گے ادھر تم کو
کتھا کے سبھی میلے
انھیں لاؤ تحریری
کہ ہوں گے کرشمے سب
پڑھو تم فسانے سب
کہ دیکھو مثالاً تم
سعادت حسن منٹو

رخت و بخت

حرفِ دعا ہی بخت کشا ہے
ہر توفیق وہی دیتا ہے

لفظ ہو یا سطرِ بامعنی
یہ سب فصلیں ہیں بارانی
کون کرے اُس بن ارزانی
عکس کوئی جو نور بھرا ہے
حرفِ دعا ہی بخت کشا ہے

ذہن میں کوئی اکھوا پھوٹے
کاغذ پر اتریں گُل بوٹے
اپنے کہے کب تارے ٹوٹے
اس کا کرم رنگ اٹھواتا ہے
حرفِ دعا ہی بخت کشا ہے

جتنے بھی سُر تان پکا لو
لہو جلا لو عمر کھپا لو
خود کو بھلے استاد بنا لو
رس نہ رچے تو شور نِرا ہے
حرفِ دعا ہی بخت کشا ہے

اپنے آپ سے ہجرت کرنا
اور کسی پیکر میں اترنا
نقل میں اصل کا جوہر بھرنا
اک انعام ہے ایک عطا ہے
حرفِ دعا ہی بخت کشا ہے

لاکھ کما لیں تن کی تھرکن
سر کر لیں ہر انگ کی اُلجھن
کس کی دین وہ انجانا پن
اندر جو ہٹ کر ناچا ہے
حرفِ دعا ہی بخت کشا ہے

کتنا سنگ شناس ہو تیشہ
دھڑکے ہاتھ کا ریشہ ریشہ
پر کوئی شہکار ہمیشہ
تحفہ ضربتِ دیگر کا ہے
حرفِ دعا ہی بخت کشا ہے
ہر توفیق وہی دیتا ہے

جلیل عالی

کمالِ فطرت ہے ایک جوہر

کمالِ فطرت ہے ایک جوہر، نفیس گوہر
ہے اُس کا ظاہر جمال پرور
وہ مَن کی دُنیا میں روشنی کا مینار بھی ہے
جہان بھر کا نکھار بھی ہے
اُسے جو دیکھیں، مناظر این و آن سارے
تو اُس کی خوبی کو غیر مشروط مان جائیں
اُسی کے قالب میں ڈھلتے جائیں
ازل ابد سے اصولِ فطرت ہے یہ مسلّم
کہ فرض جو بھی حوالے اُس کے کیا گیا ہے
وہ خُوش دِلی سے نباہ رہا ہے
نہیں تمنا یہ اُس کی ہرگز
کہ نام اُس کا ہو مشتہر بھی
وہ شہرتوں کی کمائی کر لے
زر و جواہر سے جھولی بھر لے
سلیم فطرت ہے ایسی خوبی
جو دوسروں کو نوازتی ہے
نہیں ہے خواہش یہ اُس کی ہرگز
کہ جو مقابل بھی اُس کے آئے، اُسے گرائے
وہ اس کی تذلیل کا ہُنر بھی ستم کی صورت میں آزمائے
اگر کسی کا سُرخ چہرہ
وہ اس کو پیلا، کلوٹا کالا
قرار دینے کا آزماتی نہیں ہے حربہ
وطیرہ اُس کا یہی ہے ٹھہرا
کہ دوسروں کے ہزار عیبوں کے لئے
لینے سے باز آئے
یہی ہے چاہت کہ دوسروں کو شگفتہ دیکھے
دُکھی دِلوں کو سُکھی بنائے
جو دم بخود ہیں، اُنھیں ہنسائے
غموں کی گٹھڑی سروں سے اُن کے اتار پھینکے
وہ من کی بستی میں بیج ہریالیوں کے بوئے
وہ گلشنوں کو بہار آسا بناتا جائے
کمالِ فطرت ہے ایسا جوہر

سید ریاض حسین زیدی

مت توڑو جاناں

کانچ کے برتن سے بھی نازک ہے یہ میرا دل

یوں جو اس کو توڑو گی تو جاناں یہ سوچو

کل تم اس ٹوٹے شیشے کو کیسے جوڑو گی؟

کانچ سے نازک میرے دل کو مت توڑو جاناں!

جو بھی گلہ یار رنجش مجھ سے ہو، چھوڑو جاناں!

بابری مسجد کا ایک سوال

مہرِ خموشی کیوں ہے بجائے سخنوری؟

رہتی ہے کیوں یہ اُمتِ مسلم ڈری ڈری؟

کیا یونہی اس زوال پسندی کے ہاتھ سے

جاری رہے گی صدیوں تمہاری یہ ابتری؟

کیا اب کبھی نہ نیند سے بیدار ہو گے تم؟

کیا اب نبھا نہ پاؤ گے تُم رسمِ بابری؟

پوچھے گئے سوال تو ہم سب تھے لاجواب

شرمندہ تھے کہ دیں بھلا مسجد کو کیا جواب؟

نسیم سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نہ دکھ کی موج ہی سمجھے نہ چپ کب خو جانے

وہ دل کو درد بتائے وہ گل کی بُو جانے

’چپ‘

سید افسر ساجد

اپنے اندر کے جنگل سے نکلے تو پھر
اجنبی راستے مل گئے راہ میں
ان پہ چلتے رہے
اور گذرتے رہے
شعر سنتے رہے
شعر کہتے رہے
شعر لکھتے رہے
اَن کہی تو سنی، ہاں مگر
بات کہنے کی تھی جو
ادھوری رہی
جب ادھوری کہانی نہ کہہ پائے ہم
دل میں ہلچل ہوئی اور چپ ہو گئے!!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپ بھی دیں دامن کی ہوائیں
پھول کہاں تک آگ لگائیں

نظم

حمد لکھوں گا میں ہر صنفِ سخن سے پہلے
یوں ترا نام زباں پر ہے دہن سے پہلے

تجھ کو رکھا گیا جب کچھ بھی نہ رکھا تھا کہیں
دل بنایا گیا سینے میں بدن سے پہلے

جتنا بہتر ہوں میں اب تک تری توفیق سے ہوں
میں گنہگار تھا اس چال چلن سے پہلے

اس بلا وجہ تکلف کی ضرورت کیا تھی
میں ترے ساتھ ہی تھا دار و رسن سے پہلے

سجدہ کرتا ہوں تو احساسِ ندامت کے ساتھ
درد ہوتا ہے مرے دل میں چبھن سے پہلے

یا الٰہی مجھے اس قصرِ مذلت سے نکال
کتنی آسودہ ہوائیں تھیں گھٹن سے پہلے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ نقش ایک محبت کے عکس تھے خالد
وہ رنگ اب تری تصویر سے نکال دیے

ہات پہ سورج

مائل ہوا جب نور کی برسات پہ سورج
غالب ہی رہا ٹھہری ہوئی رات پہ سورج

ہرچند کہ سارا ہی جہاں زیرِ نگیں ہے
مغرور نہیں پھر بھی فتوحات پہ سورج

نصرت کا یقیں سات ستاروں نے دلایا
نازاں نہ ہو کیوں عہدِ مواخات پہ سورج

تنویر کی تقسیم میں ہے عدل کے حق سے
معمور ہُوا صدقہ و خیرات پہ سورج

دیتا ہے تغیر کی خبر خُرد و کلاں کو
رکھتا ہے نظر گردشِ حالات پہ سورج

تھی چرخ پہ گفتار کہا نجمِ سحر نے
ناراض نہ ہو جائے کسی بات پہ سورج

شبنم کی ہے یہ موت مگر خواب ہے اس کا
آمادہ خوشی سے ہو ملاقات پہ سورج

سچائی نہیں چھپتی چاہے کوئی رکھ دے
اک ہات پہ مہتاب تو اک ہات پہ سورج

گلزار بخاری

دِن آغاز ہُوا

حامد یزدانی

دن آغاز ہُوا

اک آوارہ دن آغاز ہُوا

اک آوارہ پت جھڑ جیسا دن آغاز ہُوا

لان میں دبکے، مخمل کے بوسیدہ پتے اپنی مٹھی کھولتے ہیں

جانے، کون زبان میں یہ کیا بولتے ہیں!

میں تو اتنا جانتا ہوں

عمر کی ڈھلتی دھوپ میں یادوں کی مٹی بھی سونا لگتی ہے

کوئی بتائے

کون یہ سونا آنکھ میں بھر کر

پہروں آوارہ پھرتا ہے

سرمائی کہرے میں چھپتی جھیلوں پر

بیتے کل کے اونچے نیچے ٹیلوں پر

بس اک دن کو ساتھ لئے

سانس میں بجھتی رات لئے

کوئی بتائے

کیسے، کب

یہ ماضی کا جلتا بجھتا در باز ہُوا!؟

دن آغاز ہُوا

انتظار مت کرنا

چاند جب نکلتا ہے
ہجر کے جزیرے میں
تجھ کو دیکھ لیتا ہوں
آئینے کی جھلمل میں
خواب میری آنکھوں میں
جھلملانے لگتے ہیں
انتظار مت کرنا
نیند کی حویلی میں
رَت جگا سا ہوتا ہے
دل تڑپنے لگتا ہے
عشق کا یہ حاصل ہے
کیا خبر مسافر کی
کتنی دُور منزل ہے

انتظار مت کرنا
فاصلے کی زنجیریں
پاؤں کو جکڑتی ہے
اور گداز لمحوں کو
چاند کی ہتھیلی ہے
ٹوٹ کر بکھرنا ہے

آرزو نے اس دل پر
نرم ہاتھ دھرنا ہے
انتظار مت کرنا
میں پلٹ نہ پاؤں گا
جب صدائیں تم دو گے
وقت کا میں لمحہ ہوں
مجھ کو تو گزرنا ہے
کیا خبر ہواؤں کو
کس طرف نکلنا ہے
انتظار مت کرنا

آغا نثار

گوشۂ دل

فضائے حبس میں جو خود ہوا آباد رکھتا ہے
وہی اِس گوشۂ دل میں دعا آباد رکھتا ہے

جنھیں اُس نے مٹانا ہو مٹا دیتا ہے لمحوں میں
جسے آباد رکھنا ہو خدا آباد رکھتا ہے

فلک پر چاند تارے اور سورج رُوٹھ جائیں تو
وہ بے روشن دریچے میں دیا آباد رکھتا ہے

جنھیں یہ لوگ بنجر کہہ کے رشتہ توڑ لیتے ہیں
خدا ایسی زمینوں کو سدا آباد رکھتا ہے

محبت کا دیا اقبال تم کو یوں جلانا ہے
جفا پا کر کوئی جیسے وفا آباد رکھتا ہے

اقبال سروبہ

"سالِ نو"

خوش ہیں ہم سال کے گزرنے پر
ہم سمجھتے ہیں سال اچھا تھا
دُکھ جو ہم نے اٹھائے، بھول گئے
زخم رِستے تھے پر بُھلا دیے ہیں
رنجشیں دور کرتی رہتی تھیں
بھوک اور پیاس نے نڈھال کیا
آدمیت کا قتل ہوتا رہا
پھر بھی کہتے سال اچھا تھا

ہم نئے سال کی محبت میں
خوش گمانی کے پھول بانٹیں گے
خواب دیکھیں گے دن سنورنے کے
پر کبھی دن سنورنے والے نہیں
زخم ایسے ہیں بھرنے والے نہیں

"تلاش گمشدہ" ایران کے مشہور شاعر محمد رضا شفیعی کنی کی نظم کا منظوم ترجمہ

اک چھوٹا سا بچہ جس کا نام خوشی تھا

دیر ہوئی گھر سے نکلا تھا

پھر واپس نہیں آیا۔

اس کی آنکھیں چمکیلی تھیں

زلفیں خواب کی طرح حسیں تھیں

کہیں ملے تو

فوراً نیچے درج پتے پر

کہیے ہمیں خبر

اک جانب ہے خلیج فارس

دوسری سمت خزر*

*Caspian Sea

شاہنواز زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ایک رات کہ مائیں بچھڑنے لگتی ہیں

وہ ایک صبح کے مائیں اُجڑنے لگتی ہیں

راہ گزارِ عشق

وقت کے ہاتھ پہ رکھے ہوئے پتھر کی قسم
ہم نے زخموں کو بھی اشکوں سے پریشاں نہ کیا

دل بھی چپ چاپ ترے غم میں رہا ہے مشغول
اتنا چپ چاپ کبھی چاک گریباں نہ کیا

غم کی تقدیر نے ماتھے کو ہے چوما اکثر
اک کڑے دن میں کبھی رات ہوئی ہے دیکھو

اک تمنا کا فسوں ٹوٹ کے برسا اکثر
کس قدر نور کی برسات ہوئی ہے دیکھو

ہم تو چپ چاپ تری راہ چلے تھے لیکن
پھر بھی رستے میں محبت کے ستم بیٹھے تھے

ہم نہ پہلے کبھی خوشیوں سے ملے تھے لیکن
راہ روکے ہوئے تقدیر کے غم بیٹھے تھے

بے نشاں اپنی جوانی کی کہانی کیا ہے
ایک دردِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

اب کسی موڑ پہ اشکوں سے پریشاں کیا ہوں
ان کی نظروں میں کبھی اپنی وفا کچھ بھی نہیں

زندگی بھر ہمیں راحت سے سروکار نہ تھا
عشق جو ہم نے کیا یار وہ بیوپار نہ تھا

اویس الحسن

تاریخ سانحۂ ارتحال (مادرِ مہرباں)

سرِّ لاینحزنون میں ہے اُن کا شمار
مادرِ جاں و دِل ، باعثِ اِفتخار

زوجۂ حضرتِ باغ صد آفریں
اُن کے سرتاج عرفان کے تاجدار

اُن کے ہونے سے نور علیٰ نُور تھا
اُن کی برکت سے روشن تھے لیل و نہار

وہ یقیناً جوارِ شفاعت میں ہیں
ایک عالم ہے اُن کے لیے سوگوار

صبحِ محشر تلک گور شاداب ہو
رشکِ مہتاب تا دیر لوحِ مزار

دائم آباد اُن کی لحد خوش نشاں
روشنی روشنی سارا قرب و جوار

دی یہ تاریخ ہاتف نے تابشِ کمال
''رازدار نُوا'' و ''شرافت شعار''

تابش کمال

اک ناؤ ہے

اک دریا ہے!
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
آکاش پہ سورج چاہت کا
جذبوں کا تیز بہاؤ ہے
بچپن کی یاد کے پنچھی نے
دل نگری پنکھ بچھائے ہیں
اک شوق سمندر لہروں میں
کرنوں کا کہیں پڑاؤ ہے
اک ناؤ ہے
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
اک دنیا ہے!
دنیا کے پھیلے میلے میں
جیون کے سخت جھمیلے میں
ناؤ طوفان کی زد پر ہے
پانی میں شور سا اُٹھنے پر
یہ موج بھی رستہ بھول گئی
تتلی کا ننھوں پر جھول گئی
ماضی کی یاد کی خنک ہوا
اب بھی اس ساحل رکتی ہے
ریتیلا جدھر کٹاؤ ہے

اک ناؤ ہے
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
اک تتلی ہے!
تتلی کی نرم سی خواہش ہے
خواہش نے باغ کی شاخوں میں
چپکے سے ڈیرا ڈالا ہے
بچپن کی یاد کے پنچھی کو
خود وقت نے پیار سے پالا ہے
اک ان دیکھی منزل ہر پل
اس رنگ کو چھونے نکلی ہے
جسے لہروں نے دھوڑالا ہے
سب مدوجزر ہے لمحوں کا
سب وقت کا پیچ اور داؤ ہے
اک ناؤ ہے
دریا کے بیچ اک ناؤ ہے
اک لمحہ ہے!
جسے وقت اڑائے جاتا ہے
اک لمحہ خواہش کا لمحہ
اک لمحہ زخم ہے گھاؤ ہے
اک لمحہ پلک کنارے پر
اک لمحہ وقت کے دھارے پر
لمحوں کے انھیں جزیروں میں
گرداب، کہیں کٹاؤ ہے
اک ناؤ ہے
اے خالق، مالک
میرے خدا
یہ تند ہوا
یہ وقت کے دھارے اور دریا
سب تیرے ہیں
لیکن یہ ایک بھٹکتی تتلی کس کی ہے
دریا کے بیچ یہ ناؤ جو ہے یہ کس کی ہے

رخشندہ نوید

انصاف

نیا دن ہے
نیا سورج
نکل آئے ہیں کیڑوں کی طرح
اپنے بلوں سے لوگ
اور اس شہر کی سڑکوں
پہ روزِ حشر کا منظر ہے
جو دیکھا نہیں جاتا
سبھی جلدی میں ہوتے ہیں
مگر کوئی کبھی بھی وقت پر پہنچا نہیں ہے
زندگی مشکل سے مشکل ہوتی جاتی ہے
عمارت سے عمارت لگ کے یوں ٹھہری ہوئی ہے
جیسے اسکو بھی سہارا چاہیے کوئی
انہی میں اک تھکی ہاری عمارت ہے عدالت کی
جو ناانصافیوں کے بوجھ سے اٹھ ہی نہیں پاتی
نئے دن کا نیا سورج
عدالت کی عمارت پر چمکتا رہتا ہے لیکن
احاطے اور کمرے میں ہمیشہ ہی
اندھیرے راج کرتے ہیں
لٹیرے راج کرتے ہیں
عدالت کی عمارت پر
نیا سورج
نجانے کب وہ چمکے گا کہ جسکی روشنی
کمروں میں جائے گی
چمک اٹھیں گے مظلوموں کے چہرے
روشنی سے اور مجرم کو
سزا اپنی سنائی دے رہی ہوگی
سزا اپنی دکھائی دے رہی ہوگی
نیا دن کب وہ آئے گا
عدالت کے احاطہ میں
ہمیشہ کے لئے انصاف لائے گا

افتخار شوکت

مٹی پہ قدم

تیری آنکھوں کی پچھواڑ سے بھی گئے
تیری تنہائی کی نیلگوں آڑ میں
ہنسنے رونے کی معیاد پوری ہوئی
لوگ چھوٹے پڑے
عشق جھوٹا پڑا
سبز وعدوں کا شیشہ زمیں پر گرا
اور دنیا کی بنیاد رکھی گئی
دیکھتے دیکھتے
چار سمتوں کے آباد کاروں میں ہم منتخب ہو گئے
بن پڑھے، بن لکھے
آٹھ پہروں کے عرضی گزاروں میں ہم،
بیٹھنے لگ گئے
بھاگنے لگ گئے کاغذوں پر
گناہوں کی رفتار سے
اور لوح و قلم ہم کو چھوٹے پڑے
کانپنے لگ گئے
چار سمتوں کا بیڑہ اٹھائے ہوئے
سوچنے لگ گئے
خاک کی رسّیوں میں بندھے
اپنے قبلوں کو لادے ہوئے پشت پر
کس طرف جائیں گے
کون محراب بانہوں میں لے گی ہمیں؟
کون مینار اپنے عقب میں بٹھائیں گے؟
اپنی اداسی کو نمٹائیں گے
کون
کب کس سے۔۔۔

تو اے اوٹ والے
یہ ہم کھوٹ والے
جو گھونگھٹ کی (تیرے ہی گھونگھٹ کی)
لپٹوں سے
ناکارہ گرہوں کی صورت جھڑے تھے
جھڑے ہی رہیں گے؟

ارشد شاہین

الجھن

الجھ سی گئی ہوں
نیا سال ہے تو
پرانے کا کیا ہو!!!!
مرے پاس ایسے بہت سال ہیں
کہاں پر سجاؤں؟

کسی شیلف پہ یہ سماتے نہیں، نہ یہ ٹوٹ جائیں
یہ گٹھڑی میں بھی باندھے جاتے نہیں، مرتب رہیں
یہ ملبوس ہیں کیا؟ کہ دے دوں کسی کو
جو مجھ پہ ہے گزرا، وہ میرا رہے گا
سمجھ سے ہے باہر

کہاں رکھ کے آؤں؟

جہاں پر گذشتہ کئی سال رکھے

وہ بجھنے لگے ہیں
انھیں سانس لینے کی حاجت نہیں کیا؟
کہ زندہ ہیں گر تو کبھی ملنے آئیں

اگر مر چکے ہیں تو مدفن دکھائیں

مری کچھ دعائیں،
ابھی ان کہی تھیں

ردائیں بھی خواہش کی کھولی نہیں تھیں

جو گزری ہے اس کے کئی پل تو میں
نے چھوئے بھی نہیں تھے

لکیریں مٹیں جو پڑھی بھی نہیں تھیں
بہت دن تھے جن کی تہیں کھولنا تھیں، لپیٹے گئے وہ

یہ ظالم سفر ہے

وہ سب کچھ جو ہاتھوں سے کھونا تھا مشکل

گئے سال کیا کچھ نہیں لے گئے
جہاں پر گئے، سب وہیں لے گئے
اگر ملنا چاہوں تو حد نظر تک دکھائی نہ دیں گے

کبھی چھونا چاہوں تو بھی خود تک یہ
رسائی نہ دیں گے

تو پھر کیا کروں؟
جو میرے تھے اب وہ بھی میرے نہیں کیوں؟
الجھ سی گئی ہوں

سعدیہ بشیر

خواہش کی ایسی تیسی

عشرے
آنسوؤں اور راکھ کے درمیان میں
کہیں تخم ریز ہوتے

نئے پھول کھلتے
خوشبو کنیر کی یاد میں
جدائی کا احوال فراموش کر دیتی
کُہر آلود خنک شام کا جادو سر چڑھ کر بولتا

ثم آتے
بہتے چشموں کے تعاقب میں
گفتگو کا طلسم
محبت کے اسرار و رموز کی داستاں بیاں ہوتی
وقت کا پوسٹ مارٹم کرنے کی نوبت نہ آتی

خواہش کے دروازے سے
بارش کی گیلی چھت پر
ایک تر و تازہ وعدہ مجھ سے ہم کلام ہوتا
سورج کی آنکھیں نم ہونے سے پہلے
بہار کی ہوا سیٹی بن کر گونجتی

عشرے
بھوک کے احترام میں
خیال کی خندق سے بے نیاز
زمین پر جنت کا بندوبست کرتے
کسک دم توڑ دیتی

ستارے
صبح کے انتظار سے پہلے
میری مٹھی میں چھپے نگینوں کا احترام کرتے
کاش! ایسا ہونے سے پہلے
زمانے عمروں کے اوراق پلٹ دیتے

قید خانے کی کھڑکی سے
بخت کی روشنی ظاہر ہوتی
اور ہماری آنکھوں میں
ابدیت کی خوش فہمیوں کا انبوہ باقی رہتا

امجد بابر

...... امن کی جنگ ......

پیچھے گہری کھائی ہے اور آگے آگ کا دریا
بیچ کھڑا لاوارث بچہ
دیکھ رہا ہے، سوچ رہا ہے!
جس کے گھر کے سب افراد
امن کے نام پہ مارے گئے
اور دھرتی پہ وارے گئے

کتنی جنگیں لڑی گئیں
کیسے کیسے ہتھیاروں سے انسانوں کا خون بہا
طاقتور ملکوں نے کیسے!
امن کے نام پہ جنگی ہتھیاروں کو بیچا
امن کے عالمی سوداگر
اب تک ناحق مرنے والے
آخری انساں کے
ذمہ دار ہیں لیکن
طاقت اور ہوس کا نشہ
کھا جاتا ہے نسلوں کو
مذہب اور وطن کے نام پہ آئے دن
معصوموں کا ایندھن بنتا رہتا ہے

اُجڑے گھر کا لاوارث بچہ
دیکھ رہا ہے، سوچ رہا ہے!
کبھی کوئی ایسی جنگ بھی ہوگی
جس میں چاہے سب مارے جائیں
امن کے نام پہ وارے جائیں
لیکن جنگ ہو امن کی خاطر
جس کا مقصد بعد از جنگ بھی جنگ نہ ہو
باقی ماندہ کوئی شخص بھی تنگ نہ ہو
خوشحالی کے خوابوں کو تعبیر ملے
بنجر آنکھیں ہوں شاداب
بجھے ہوئے چہروں پہ ہنسی کے پھول کھلیں
زندہ رہنا جرم نہ ہو
سوچوں پہ پہرے نہ ہوں
زخم اتنے گہرے نہ ہوں

اُجڑے گھر کا لاوارث بچہ
دیکھ رہا ہے، سوچ رہا ہے!
امن کی جنگ کے خدوخال
اس خواہش میں بیت گئے ہیں کتنے سال!
بال سیاہ، سفید ہوئے ہیں!
عمرِ رواں نے تیزی سے
پاؤں رکھے ہیں شام کی اُس دہلیز پہ آ کر

ظہور چوہان

جہاں سے مُڑ کر پیچھے دیکھو
صبح کے منظر بنے ہوئے ہیں
ماضی کے دُھندلے اوراق
موت کا دھڑکا لگا ہوا ہے
اور شکاری گھات لگائے بیٹھے ہیں
وقت اگرچہ ہے محدود
لیکن خواہش زندہ اور تر و تازہ ہے
آنکھوں میں ہر خواب جواں ہے
تعبیریں شرمندہ ہیں!

اُجڑے گھر کا لاوارث بچہ
دیکھ رہا ہے، سوچ رہا ہے!
اور اب بھی سراپا سوال کھڑا ہے
امن کے سوداگر
طاقت اور ہوس کے نشے سے
جانے کب باہر نکلیں گے!
بے بس اور معصوموں کے دن
پتہ نہیں کب بدلیں گے!
امن کی جنگ جو آخری ہوگی
تاریکی کے گھٹے ہوئے ماحول میں
جس سے روشنی ہوگی
اُس کا ہوگا کب آغاز!
مظلوموں اور لاوارثوں کو
آخر ملے گی کب آواز؟

ہنسنا

میری بیوی اچانک میرے پاس آ گئی
جب اس نے مجھے ہنستے دیکھا!
اس نے ہتھیلی پر ہتھیلی ماری اور خوب ہنسی
میں نے کہا: مجھے پریشان مت کرو میں بالکل ٹھیک ہوں
میرا روگ بھی ٹھیک ہے اور میری شکستہ دلی بھی درست ہے
تم اطمینان رکھو ہر چیز پہلے کی طرح ہے
میرا ہنسنے کا ارادہ نہ تھا
میں تو احتیاطاً اپنے منہ کی کچھ ورزش کر رہا تھا
کہ شاید کسی دن مجھے ہنسنا پڑے.....
شاید!

احمد مطر العراقی
مترجم: محمد احمد

درگزر

الحذر!
مرے تمام خواب ہیں
کسی کی چشم نکتہ چیں کے منتظر
مرے تمام شعر ہیں
کسی کے حرف لم یزل کے تابعی
مرا ہر اک خیال اک فساد کے تعوذ و طلسم سے ڈھکا ہوا
سو اس طرح کی کھوکھلی سی بے ضرر سی شاعری سے درگزر

علیم زبیر

نثری نظم

اپنے اپنے دکھ کے سنگ ہمیں تنہا ہی جینا پڑتا ہے
کوئی شانہ نہیں ملتا جس پہ سر رکھ کر آنسو بہا لیں
دل کے بوجھ کو ہلکا کر لیں
خوشی میں ساتھ ملکر ہنسنے والے تو بہت ملتے ہیں
لیکن دکھ کا سفر تنہا ہی کاٹنا پڑتا ہے
ویسے تو رشتوں کی منڈی میں سیل لگی ہے
غرض کے رشتے
کچھ مجبوری کچھ فرض کے رشتے
پیار، محبت، گریز کے رشتے
درد بانٹنے والا رشتہ
کسی مول نہیں بکتا
قبروں پر پھول چڑھانے تو سب آتے ہیں
تا دیر مرقد پہ کوئی نہیں رکتا

نائلہ راٹھور

نظم

تمہاری آنکھ جب نم ہو
تمہارا دل بھی جب دھڑکے
تمہارے دل کو چھو جائیں
ہمارے ساتھ گزرے پل
تمہارے ساتھ جو گزرے
محبت کے سبھی موسم
تمہاری آنکھ سے آنسو
تمہارے لب کو چھو لے جب
تمہیں اس کی خبر نہ ہو
تو میرے رازداں، ہمدم
فقط اتنا سمجھ لینا
تمہیں مجھ سے محبت ہے

آفرینہ آفرین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر مجھ کو چراغوں نے ٹھہرنے نہ دیا
میں وہ لَو تھا جسے سورج نے اُبھرنے نہ دیا

خطوط

آصف ثاقب

واجب الاحترام عمران منظور صاحب

دعائے خیر نصیب ہم باد۔ 'بیاض' اپنی رونقیں اپنی محبتیں لے کر پھر آباد ہوا۔ ادب کے ہر پہلو میں اس کی جیتی جاگتی صورت دیکھی۔ خطوط میں احمد ندیم قاسمی کا تذکرہ بھلا سے کا تھا۔ احمد ندیم قاسمی اردو ادب میں بڑا نام ہے۔ ان کے مدیحی ہیرائے اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ ان کے انکسار کی عظمت خود سپردگی کی شان اور شفقت کا والہانہ پن بے مثال ہے۔ رسالہ فنون کے ذریعے سے انھوں نے جو گلستاں سجائے ہیں۔ ان کے بیل بوٹے ہمیشہ سرسبز رہیں گے۔ ان کا یہ شعر زندہ و پائندہ ہے:

میری پہچان تو مشکل تھی مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے
احمد ندیم قاسمی

خالد احمد کی بیاض دسمبر کی غزل میں ندیمانہ اثرات کی خوش اسلوبی نمایاں ہے۔ احمد ندیم قاسمی سے خالد احمد کی محبت ہر طرزِ عمل سے ضوفشاں ہے۔ خالد احمد کے یہ شعر دیکھیں:

آپ بھی دیں دامن کی ہوائیں
پھول کہاں تک آگ لگائیں
پچی نیند میں ہیں اندیشے
اٹھ نے میں جاگ نہ جائیں
بس اک کھٹکا بس اک دھڑکا
یاد نہ رکھ لیں بھول نہ جائیں

خالد احمد نے انفرادیت میں جو سر نکالا ہے وہ بلندی کو چھو رہا ہے۔ لفظوں کے خوب صورت چناؤ میں وہ صاحب حیثیت شاعر ہیں۔ خطوط کا حصہ گو مختصر تھا مگر خوب رہا۔ حسب معمول لکھنے والے پسندیدہ لوگ تھے۔ 'شاعر امروز' نے 'بیاض' باغ و بہار ہے۔ شاہد ماکلی صاحب نے یہ مزے کا سامان کیا ہے۔ شاعر امروز کے یہ شعر:::

یہ روز روز کا بجھنا مجھے نگل جاتا
خدا کا شکر کہ شامیں اداس ہونے لگیں
نادیہ گیلانی

کام آسان تو نہیں لیکن
اس کو ہنس کر دکھا رہا ہوں میں
عقیل بخاری

شاعر امروز کا سلسلہ جاری رہے۔ شاہد ماکلی صاحب دستِ قلم ہیں۔

خیر اندیش

نسیم سحر

محترم عمران منظور صاحب

سلام مسنون!

خلافِ معمول اس مرتبہ بیاض چھ تاریخ کو موصول ہوا۔ ایک دو دن میں اس کے تمام مشمولات کا مطالعہ تو کر لیا تھا مگر پھر اس پر کچھ لکھنے کی فرصت بھی دو دن کے بعد آج اس لیے نکالی کہ دس تاریخ کے بعد بھیجی جانے والی تحریر شائع ہونے کا امکان کسی قدر کم ہوتا ہے۔ اس مرتبہ خطوط کا حصہ بھی خاصا مختصر لگا اور صرف چار خط اس میں شامل تھے۔ شاید احباب کچھ زیادہ مصروف ہو گئے ہیں۔ خطوط کے حصے میں ہی محترمہ درِ دانہ نوشین خان کی اس تجویز کی حمایت کرتا ہوں کہ اس حصے کی فونٹ وہی رکھی جائے جس میں بیاض میں دیگر تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ جناب فیض رسول فیضان کا خط چاروں خطوط میں سے طویل ترین اور یک موضوعی تھا۔ کاش وہ احمد ندیم جیسی عظیم شخصیت پر خط میں اظہارِ خیال کرنے کے بجائے اسے ایک مکمل اور بسیط مضمون کی شکل دیتے تو محققین کے علاوہ قارئین کے لیے بھی اچھا ہوتا۔

اس مرتبہ محترمہ تسلیم کوثر پر میرے ارسال کردہ مضمون پر کافی قینچی چلائی گئی ہے۔ ظاہر ہے مجھے آپ کے مدیرانہ اختیارات پر معترض ہونے کا کوئی اختیار نہیں مگر ایسا کرتے ہوئے کہیں کہیں میرا مضمون بے ربط سا ہو گیا ہے۔

اس شمارے میں بہت سی تحریروں پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا مگر صرف جناب محمد ارشاد جیسی عالم فاضل شخصیت کے "نکات و لکات" کی تعریف کروں گا کہ بہت ہی اہم، بلکہ بہت ہی نازک، موضوع بھی اس طویل مضمون میں شامل کر دیے ہیں جنھیں پڑھنے سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوا بلکہ جناب محمد ارشاد کی ہمہ جہت شخصیت پر بھی حیرت ہوئی کہ کیسا کیسا ادبی، تاریخی اور لسانی سرمایہ ان کے خزانے میں ہے اور جس سے وہ ہمیں نواز رہے ہیں۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

شمارہ دسمبر ۲۰۲۲ء ہاتھوں میں ہے، دیدہ زیب گلدان کی تصور کے ساتھ۔ حسب سابق اس میں خوبصورت غزلوں، نظموں کا شعری انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نثر پاروں سے سجا ہوا خوبصورت سرورق کے ساتھ دیدہ زیب رسالہ۔ پہلے کی طرح شاعری کے گلدستے میں کئی کھلتے ہوئے پھول مہک رہے ہیں۔

پہلے ہی صفحہ پہ خالد احمد کی غزل بھرپور معنویت کے ساتھ:

کچی عمر کا دھن ہیں سپنے　　اک کھٹکے سے ٹوٹ نہ جائیں

شروع میں حمد و نعت کے گلدستے مہکتے ہوئے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ بقول سرور حسین نقشبندی:

سبز گنبد جو دھیان میں آیا　　دل نے پائی ہیں راحتیں کیا کیا

عمدہ غزلوں سے مزین اس شمارے میں مختلف غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے

یہ ممکن ہے کہ خالی ڈھیر ہی رہ جائے لفظوں کا	کہانی سے اگر اک مختصر خاکہ نکل جائے	جلیل عالی
اپنا دامن چاک بھی رکھ کر	تیرا دامن سی سکتے ہیں	نسیم سحر
سبھی کو مل نہیں جاتا کوئی تحفہ محبت میں	ہر اک انسان مر کر بھی صاحب مرقد نہیں ہوتا	خاور اعجاز
زمین جتنی بھی مرے پاؤں میں ہے وہ رہے	تو میرے حصے کی اتنی مجھے خدائی دے	قیوم طاہر
غم کی تکمیل کر رہا ہوں میں	اپنے حصے کا مر گیا ہوں میں	یونس خیال
رشتوں کی یہاں پاؤں میں زنجیر پڑی ہے	پیچھے مگر انسان کے تقدیر پڑی ہے	شہاب صفدر
وقت اپنے لیے بچا نہ سکے	وقفِ احباب ہوگئے ہیں ہم	اشرف نقوی

امجد اسلام امجد بڑے خوبصورت شعر کہتے ہیں ان کی نظمیں کمال کی ہوتی ہے۔ یہاں ان کی نظم ''خدا وہ دن نہ دکھلائے'' سے چند مصرعے ملاحظہ کیجئے:

خدا وہ دن نہ دکھلائے / کہ آنکھیں بھول ہی جائیں / حریمِ خواب کا رستہ / کہ پھر بادل میں چھپ جائے کہیں مہتاب کا رستہ　　(امجد اسلام امجد)

یہ شمارہ خوبصورت غزلوں، نظموں افسانوں اور مضامین سے مزین ہے۔ جو ہمیں عصر حاضر کے ادب سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا خط ہے جس میں تفصیلی مضمون قلم بند نہیں کیا جا سکتا اسی لیے دیگر ادیبوں شاعروں کے کلام کی خصوصیات کو چاہنے کے باوجود اتنے کم الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

محمد شفیق انصاری

محترم و مکرم جناب عمران منظور صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

اُمید واثق ہے کہ آپ اور ''بیاض'' کی تمام ٹیم بخیر و عافیت ہوں گے۔ ماہ دسمبر کا ''بیاض'' نظر نواز ہوا۔ بہت خوشی ہوئی۔ یہ اس سال 2022 کا آخری شمارہ ہے۔ اور آپ کی ادب کے ساتھ وابستگی روز روشن کی طرح عیاں ہے اور مسلسل محنت سے ہم ادب کے ادنیٰ طالب علموں اور قارئین تک ''بیاض'' کا پہنچنا بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔ بے شمار ادبی جرائد ادبی منظر نامے سے معدوم ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ نے جس طرح مرشدی خالد احمد کی رحلت کے بعد اس کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔ یہ ادب کی تاریخ میں سُنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

سال 2022 اپنے اختتام کو ہے۔ یہ سال مجھ ناچیز پہ بہت ہی وزنی اور مصائب و مشکلات کا شکار

رہا ہے یکے بعد دیگرے والد صاحب اور والدہ محترمہ کی رفات اور دیگر افراد کی وفات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا یہ میری زندگی کا مشکل ترین اور گراں سال گزرا۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے نیا سال 2023ء آپ کے لیے، بیاض کی تمام ٹیم اور قارئین بیاض کے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے۔ آپ سب کو صحت وسلامتی کے ساتھ نیا سال 2023 مبارک ہو۔ والسلام

فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب، مکرمی اعجاز رضوی صاحب، تسلیمات!

دسمبر اور جنوری کے شماروں کے حوالے سے برسوں پرانے اپنے چار مصرعے یاد آئے:

ہمارا جنوری سے کام کیا ہے — محرم سے ہماری ابتدا ہے
شہادت سے جو ہے آغاز اپنا — تو قربانی پہ اپنی انتہا ہے

سن دو ہزار بائیس کا بارھواں اور آخری شمارہ معنوی انبساط اور ادبی نشاط کے خوش کن جلو میں نظر نواز ہوا۔ سرورق اور پس ورق کے اندرون میں کتب اور شعرا کی زیارت سے بہجت افزائی......... کیا ہی کہنے اور بہت ہی خوب!

بیاض کے بانی، مدیر اور جدید تر غزل کے صاحب اسلوب شاعر، حضرت خالد احمد کی غزلوں کی بحر تو چھوٹی ہے مگر مقام و مرتبہ بہت بڑا ہے۔ ذرا ایسے من موہنے شعر کوئی کہہ کے دکھائے:

دھڑکنوں کی چنچل شامیں — ہاتھ تک آئیں ہاتھ نہ آئیں
راتیں دم نہ لیں کٹنے کا — سڑکیں کب تک ساتھ نبھائیں
لوہے کا دل رکھنے والے — لوہے کا پانی پی جائیں
یار گدائی کو نکلے ہیں — ہاتھ کا برتن بیچ نہ آئیں

یہ قیامت لہجہ، روایتی قافیہ پیمائی سے کہیں آگے کی چیز ہے جو پھیکے جدیدیوں اور روکھے تجریدیوں کے بس کی بات نہیں۔ بقول غالب:

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

حمد و نعت کے تحت شعرائے کرام کا خراج عقیدت، قابل دید اور لائق داد ہے۔ انور مسعود کو میں عہد حاضر کا اکبر الہ آبادی کہا کرتا ہوں۔ مزاح کا ٹھپہ تو یوں ہی لگ گیا، ویسے موصوف سنجیدہ شاعری میں بھی کسی سے کم نہیں۔ ان معدودے چند سخنوروں میں شامل ہیں، جو سٹیج پر زندہ اور کتاب میں پائندہ رہتے ہیں۔ انور صاحب کا ایک جاوداں شعر:

اب اس کے خال سے چلتے ہیں گیسوؤں کی طرف — سٹ کے دیکھ لیا ہے بکھر کے دیکھتے ہیں

جناب محمد ارشاد کا تجزیاتی مقالہ، ثقافت و نشاط، اُن کے تبحرِ علمی و تخیلِ ادبی کا غماز مستند ہے جس کا تاریخی، تہذیبی اور اعتقادی مد و جزر پڑھنے، سننے اور دیکھنے کی چیز ہے۔ غبارِ خاطر اور دیوانِ حسرت کے وسیلے سے حضرت ارشاد کو ایک شعری سلامی!

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر — شعرِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

شاہد حمید کی یاد میں، حسن عسکری کاظمی کی تحریر عمدگی و پختگی کا نمونہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ (مرحوم) کے ہونہار فرزندگان شاہد اور امر شاہد اپنے والد کے لگائے پودے کو، جہلم بک کارنر، کی صورت میں، علم و ادب کی ترویج و اشاعت کا چھتنار درخت بنا چکے ہیں۔ تسنیم کوثر کے افسانوی مجموعہ، چھبن، پر تبسم سحر نے اپنی مختصر جامع تحریر میں گویا مبسوط مقالے کی تلخیص کو خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔ توصیف تبسم پر نثار ترابی کا متوازن معلوماتی مضمون، خاصے کی چیز ہے جس سے موصوف کی کثیر الجہات شخصیت کے کئی گوشوں پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ تبسم صاحب کا ایک کمال شعر:

قرار جاں جسے کہتے ہیں جاں سے باہر ہے — یہ اک ستارہ کہیں آسماں سے باہر ہے

فرحت عباس شاہ کے، فلسفہ شاعری، سے موصوف کی نثری صلاحیت اور تنقیدی بصیرت کا بھی بخوبی ادراک ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے دو منتخب شعر:

تو نے دیکھا ہے کبھی ایک نظر شام کے بعد — کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد
فرقت عمری ہو جاتی ہے — روز کچہری ہو جاتی ہے

خاور اعجاز نے، نئے غزل گو۔ ایک تاثر، میں ثابت کیا ہے کہ عالی ظرفی سے اعتراف عظمت کے بغیر، حصول عظمت ممکن نہیں۔ براہ کرم موصوف شعری مثالوں اور حوالوں کا دائرہ وسیع فرمائیں۔ شکریہ! اعجاز صاحب کے دو زندہ شعر:

درختوں میں بھی انسانی رویے پائے جاتے ہیں | شجر ہوتے ہوئے بھی ہر کوئی برگد نہیں ہوتا
گذر رہی ہے اُمیدِ بہار پر ورنہ | پڑی ہے زرد مری شاخِ آشیاں کب کی

دیگر مضامین بھی خوب ہیں۔ غزلیں، نظمیں اور افسانوی مندرجات و شمولات بھی مسحور کن اور شاداب کار ہیں۔ خط کی قلیل گنجائش کے باعث طوالت سے گریز لازمی ہے سو معروضات کو سمیٹتے ہوئے اور جناب کی ادارتی مساعی جمیلہ کو سراہتے ہوئے، ایک نئی غزل اور منتخب اشعار کے ساتھ اجازت۔ والسلام

شیخ اپنی طبیعت سے جاتے نہیں سے خانے	احباب انھیں لے جا کر چھوائیں تو کیا کہنا	انور شعور
میں اکیلا کر نہ بجھا دوں کہیں اپنا چولھا	اپنے ہاتھوں ہی نہ مروا دے مرا جوش مجھے	راحت سرحدی
مر گیا ہو جو آنکھ میں ہی کہیں	ایسا اک خواب ہو گئے ہیں ہم	اشرف نقوی
بن جاتا ہے یہ کمزوری لوگوں کی	کتنی طاقت ہوتی ہے اس پیسے میں	محمود کیفی
خطرہ ہمیں دشمن سے نہیں اتنا زیادہ	ہم جب بھی مریں گے تو محبت میں مریں گے	اشرف کمال
اس نے آواز جو دی اپنے دریچے سے مجھے	سُر مرے ذہن میں رقصاں ہوئے شہنائی کے	ناصر نقوی
کچھ ضروری تو نہیں یہ بھی ہو پہلے جیسا	دوسرا موڑ خطرناک بھی ہو سکتا ہے	احمد محمود
تو نہ سمجھے گا مری جان یہ کشمیر کا دکھ	دل کے جذبوں کو میں اخبار بناتا کیسے	رانا محمد شاہد
اک تماشا سا ہے اب تک روبرو پھر بھی خاموش ہوں	چاہتا ہوں کہ میں بھی کروں گفتگو پھر بھی خاموش ہوں	رجب علی رجب
انگلیوں سے بندھی پتلیاں کئی ڈوری کے جھٹکے سے حرکت کریں	ہر صدا پر لبوں کو ہلائیں مگر خود نہ بولیں	اعجاز رضوی

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی
السلام علیکم!
دسمبر کا "بیاض" دلکش سرورق کے ساتھ ملا۔ گلدان کے نیچے موجود ضخیم کتابیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ مضامین حسن عسکری کاظمی، درخشندہ نوید، عاطف جاوید عاطف اور مقصود خالق کی تحریریں متاثر کن تھیں۔ خاص طور پر شاعری کے حوالے سے فرحت عباس شاہ کی 'فلسفۂ شاعری' اور خاور اعجاز کی 'نئے غزل گو' ایک تاثر' دلچسپ رہیں، کلاسک شعرا میں حسنین احمد نے اکبر الہ آبادی کو یاد کیا۔ شاعری اور ان کی فکر تقاضا کرتی ہے کہ ان پر نمایاں کام کیا جائے۔ افسانوں میں سید تحسین گیلانی کے 'دتا کاما' نے بہت متاثر کیا۔ انھوں نے اردو اور پنجابی الفاظ کا بہترین استعمال کیا۔ گاؤں کی ثقافت کی خوبصورتی سے عکاسی اور سب سے بڑھ کر اختتام حیران کن رہا۔ تحسین بھائی کے افسانوں کی کتاب 'منٹو کا جگت' حال ہی میں بھارت سے شائع ہوئی ہے۔ شائع ہونے سے پہلے ان کے مسودے کے کچھ افسانے میرے مطالعہ میں رہے۔ ان کا طرزِ تحریر بہت دلچسپ اور منفرد ہے۔ کتاب کی اشاعت پر انھیں مبارکباد۔ طنز و مزاح اور خاکے تمام ہی اچھے لگے۔ انور مسعود کا خاکہ 'میری نانی اماں' پڑھتے ہوئے اپنی نانی اماں یاد آتی رہیں۔ ناصر بشیر نے مجیب الرحمٰن شامی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑے اچھے انداز میں لکھا۔ محمد کلیم کا 'میں کون ہوں' بھی دلچسپ۔ غزلیں جن کے کچھ اشعار پسند آئے:

دنیا ہے مہمان سرا	یعنی سب کو جانا ہے	
جیون کی اس گٹھڑی کا	سب نے بوجھ اُٹھانا ہے	امجد اسلام امجد
کھویا رہتا ہوں اس کی یادوں میں	جس کو عادت ہے بھول جانے کی	
سر اُٹھاتی ہیں کیسی افواہیں	اور وہ بھی بہار آنے کی	یعقوب پرواز
وہ جو لوگ دل کی کتاب تھے، وہ کہاں گئے	جو محبتوں کا نصاب تھے وہ کہاں گئے	
وہ جو دوست اچھے تھے خوب اچھے تھے کیا ہوئے	جو ذرا ذرا سے خراب تھے وہ کہاں گئے	افتخار شوکت

جو ہونے والا تھا سب کو بتا دیا گیا تھا — اور اس کے بعد دیے کو بجھا دیا گیا تھا
وہ پلٹ آیا تو کیوں پڑھتے ہی اسے اکرم — غزل کا شعر تھا یا آئینہ دیا گیا تھا
اکرم ناصر

اس زمیں کا بڑا مسئلہ لوگ ہیں — یہ خدا کے سوا جو خدا لوگ ہیں
کل عجب واقعے پر میں ہنستا رہا — بے وفا نے کہا، بے وفا لوگ ہیں
صغیر احمد صغیر

نظموں میں محمد انیس انصاری کی نبی کریمؐ کی محبت میں لکھی نظم "اگر تم نہ ہوتے" بہت پسند آئی۔ خوبصورت انداز میں لکھی گئی۔ اسی طرح اقبال سروبہ کی "یاد کا دسمبر" دانش عزیز کی "کاٹے مٹی کا خدا" اور اعجاز رضوی کی "کچی پتلیاں" بھی بہترین رہیں۔

رجب علی رجب

محترم جناب عمران منظور صاحب

السلام علیکم

ماہنامہ ریاض نومبر اور دسمبر میں اس ناچیز کی نظم شائع کی بہت بہت شکریہ۔

ماہنامہ ریاض دسمبر 2022 کا ٹائٹل بہت خوب صورتی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ شمارے کی ابتدا سید ریاض حسین زیدی کی حمد سے ہوئی:

مصیبت کو جب مشکلوں سے گزارا — فقط کام آیا خدا کا سہارا
سفینہ جو منجدھار میں ڈولتا تھا — اسی سے ملا عافیت کا کنارا

بہت خوب صورت حمد پیش کی جناب زیدی صاحب نے۔

اسی طرح اگر نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کی جائے تو آصف ثاقب، جلیل عالی، عقیل رحمانی، سرور حسین نقشبندی، حامد علی سید اور خاص طور پر عامدار حسین نے کیا خوب شان بیان کی ہے محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی:

خوف کے عالم میں ہوں سینے پہ دم فرمایئے — یا رسول اللہ، یا نبی اللہ، کرم فرمایئے
راستہ بھی آپ ہیں منزل بھی میری آپ ہیں — میری آنکھوں پہ بھی وا نقش قدم فرمایئے
آپ ہی بخشش کی ہیں امید میری آخری — نامۂ اعمال میرا خود رقم فرمایئے

غزلوں کا گلدستہ بھی دسمبر کے شمارے میں بہت خوب صورتی سے سجایا گیا ہے خاور اعجاز صاحب، راحت سرحدی صاحب، حامد یزدانی صاحب، شہاب صفدر صاحب، طالب انصاری صاحب:

قدرت نے اپنا قرض اتارا ہے اور بس — اس کے رخ حسیں کو سنوارا ہے اور بس
اب اور اس کے حسن کی تعریف کیا کریں — کچھ جو دیا ہے سب سے وہ پیارا ہے اور بس

اور اگر اسی طرح اکرم جاذب کا تذکرہ کروں تو اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتا ہوں کیا خوب لکھتے ہیں جاذب صاحب ان کی غزل کے دو شعر مجھے تو بہت اچھے لگتے ہیں:

اک دعا ہے جو مرے سر پہ تنی رہتی ہے — ورنہ ہر وقت کہاں چھاؤں گھنی رہتی ہے
پیاس لگتی ہے تو اصغر کا خیال آتا ہے — دل میں پیوست وہ تیرے کی انی رہتی ہے

اسی طرح رخشندہ نوید صاحبہ، علیم سید صاحب، شفیق آصف صاحب، عاطف جاوید عاطف صاحب جو کے کمال کا لکھتے ہیں

اور اگر افسانوں کی بات کروں تو حمزہ حسن شیخ بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور بہت خوب صورت ترجمہ کرتے ہیں

ماہنامہ ریاض بہت مقبول رسالہ ہے اور ادب سے وابستہ لوگوں کی اولین پسند ہے بیشتر لائبریریوں اور ادیب لوگوں کی محفل کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

مالک سے دعا ہے مزید کامرانیاں اس ادارے کا مقدر ٹھہریں

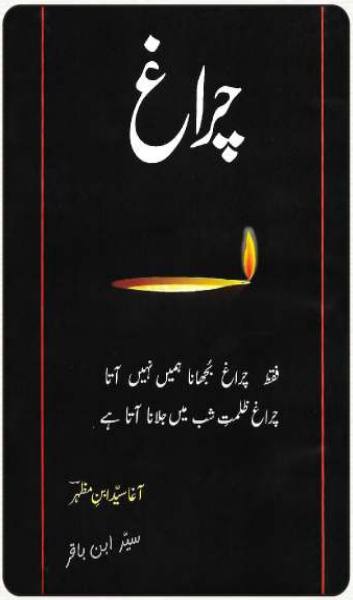

چراغ
فقط چراغ بجھانا ہمیں نہیں آتا
چراغ ظلمتِ شب میں جلانا آتا ہے
آغا سیّد ابنِ مظہرؔ
سیّد ابن باقر

پُھلّاں دی مہکار مدینے
(پنجابی نعتاں)
علی رضا

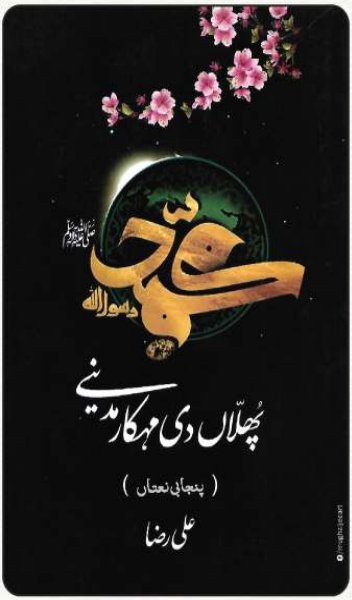

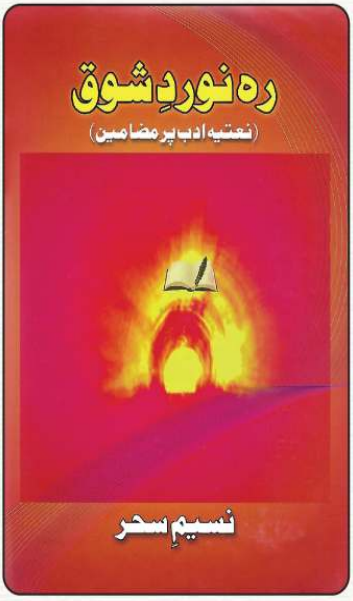

رہ نوردِ شوق
(نعتیہ ادب پر مضامین)
نسیمِ سحر

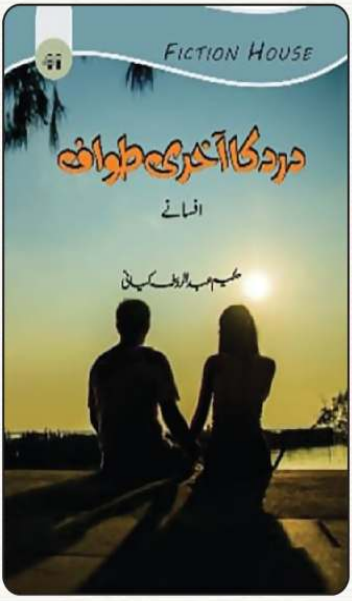

FICTION HOUSE
درد کا آخری طواف
افسانے
حکیم عبدالرؤف کیانی

2023
سالِ نو مبارک